ماہنامہ

اشراق

لاہور

اگست ۲۰۲۵ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

طالب محسن

مدیر انتظامی

جواد احمد غامدی

1979 سے جاری شدہ

اشاعت کے 46 سال

"اللہ کے نبیوں کو ماضی، حال اور مستقبل کے بعض حقائق بالعموم رؤیا ہی کے ذریعے سے دکھائے جاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ بھی مخاطبۂ الٰہی کی ایک صورت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم ہے کہ آپ کے لیے اِس کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی تھی۔ اِس طرح کے خواب بعد میں بھی آپ کو وقتاً فوقتاً دکھائے گئے۔ چنانچہ اِسی نوعیت کے مشاہدات ہیں، جن میں جنت اور جہنم کے دکھائے جانے کا ذکر بھی ہوا ہے۔"

____ معارف نبوی

- کسی کو اپنی دولت و ثروت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھنا چاہیے اور نہ خدا کی عنایتوں کو اپنی قابلیتوں کا حاصل یا اپنے مزعومہ شرکا کی کرشمہ سازی خیال کرنا چاہیے۔ یہ بارش جس پر تمام معیشت کا انحصار ہے، اِس کے لیے آسمان کے بند دریچوں کو وہی کھولتا ہے۔ یہ اُس کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی اُس کو روک کر وہ لوگوں کو اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ (قرآنیات)
- غصہ اپنی ذات میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ انسان کی حمیت، غیرت اور عزت نفس کا ایک فطری تقاضا ہے۔ تاہم اِسے حدود سے متجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ (معارف نبوی)
- زندگی گود سے لے کر قبر تک عسر و یسر کے مراحل سے عبارت ہے۔ انسان کی سب سے بڑی طلب یہ ہے کہ اس کی زندگی محفوظ ہو، باسہولت ہو اور اس کے ذوق کے مطابق ہو، یعنی اس کی اکل و شرب اور بود و باش کی ضروریات بھی فراخی سے پوری ہوں، اسے آسانیاں اور آرام بھی حاصل ہوں اور اسے تزئین و آرایش کے وسائل بھی فراہم ہوں۔ (شذرات)

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۷ شمارہ ۸ اگست ۲۰۲۵ء صفر المظفر ۱۴۴۷ھ

فہرست

شذرات

ستم ہاے روزگار — طالب محسن — ۴

قرآنیات

البیان: الشوریٰ ۴۲: ۲۱-۴۳ (۳) — جاوید احمد غامدی — ۸

معارف نبوی

قیامت میں شفاعت — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — ۱۸

آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی میں تیزی — جاوید احمد غامدی / محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز — ۳۱

سیر و سوانح

السابقون الاولون من الانصار (۷) — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۶

نقطۂ نظر

علامات قیامت: بائیبل اور قرآن کی روشنی میں (۱) — ڈاکٹر محمد سعد سلیم — ۴۷

اصلاح و دعوت

لفظ اور معنی کا تعلق — محمد ذکوان ندوی — ۶۰

دین یا فرقہ؟ — خورشید احمد ندیم — ۶۴

شخصیات

حیات امین احسن (۲۳) — محمد بلال — ۶۸

بزم طلبہ

سفرِ طائف ـــــ احساسات — نوازش منعم — ۷۸

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد | محمد رفیع مفتی
طالب محسن | محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر عبید الرحمٰن | ڈاکٹر ساجد حمید
ڈاکٹر شہزاد سلیم | آصف افتخار
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر | خورشید احمد ندیم
اظہار احمد | کوکب شہزاد
جنید حسن | مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

طالب محسن

ستم ہاے روزگار

زندگی گود سے لے کر قبر تک عسرو یسر کے مراحل سے عبارت ہے۔ انسان کی سب سے بڑی طلب یہ ہے کہ اس کی زندگی محفوظ ہو، باسہولت ہو اور اس کے ذوق کے مطابق ہو، یعنی اس کی اکل و شرب اور بود و باش کی ضروریات بھی فراخی سے پوری ہوں، اسے آسانیاں اور آرام بھی حاصل ہوں اور اسے تزئین و آرایش کے وسائل بھی فراہم ہوں۔ مزید برآں، اس کے ظاہری اور باطنی وجود کی تکمیل کا سفر بھی کامیابی سے ہم کنار ہو۔ اس کے ساتھ انسان یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کا ماحول اسے جانے، اس کی قدر کرے اور اس کی شخصیت کی نمود اور تکمیل میں اس کا مددگار ہو۔ نہ صرف یہ کہ وہ اپنے ماحول میں محبوب اور مطلوب ہو، بلکہ اس کے غیاب میں اور اس کے بعد بھی اسے ایک اچھے انسان کے طور پر یاد رکھا جائے۔[1]

لیکن عملاً اس کی زندگی 'اے بسا آرزو کہ خاک شدہ' یا بقول غالب: '<u>بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے</u>' کی تصویر نظر آتی ہے۔

---

[1] اگر یہ انسان مذہبی ہے تو اس کے ساتھ آخرت کی فلاح اور قرب بارگاہ پروردگار کی تمنا بھی شامل ہو جائے گی۔ یہاں ہم نے صرف اس مذہبی تمنا کا ذکر کیا ہے جس کی تصویب قرآن مجید سے ہوتی ہے، ورنہ مذہبی شخصیات اس دنیا میں دین و دنیا کا جو کچھ حاصل کرنا چاہتی ہیں، اسے لکھا جائے تو ایک دفتر درکار ہے۔ سری طاقتیں اور شخصی تفوق تو سامنے کی باتیں ہیں۔ اوپر اصل مضمون میں ہم نے ان مذہبی تمناؤں کا ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ ہمارے مضمون میں نکات کے معنوی تسلسل سے اس کا براہ راست تعلق نہیں۔

قرآن مجید میں 'رزق' کے لفظ کو اگر ان سب کے لیے جامع معنی میں لیا جائے تو خدا امتحان کے مقصد سے انسان کے ساتھ یہ معاملہ کر رہا ہے:

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ. (الرعد ۱۳: ۲۶)

"اللہ جسے چاہتا ہے، کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، گنا چنا۔"

انسان کی پوری زندگی نعمت و نقمت کے اتار چڑھاؤ میں گزرتی ہے۔ کبھی اور کہیں آسانی کا معاملہ ہوتا ہے اور کبھی اور کہیں سختی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب کوئی سختی آتی ہے، خواہ وہ بیماری کی صورت میں ہو، خواہ کوئی اور تنگی اور تکلیف ہو، بندے کا دل غم زدہ ہو جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی یہ کیفیت کس خوبی سے بیان کی ہے:

اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ. (یوسف ۱۲: ۸۶)

"میں اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ صرف اللہ ہی سے کرتا ہوں۔"

یہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا اعلیٰ شعور بندگی ہے کہ اپنی اولاد سے پیش آنے والے غم اور تکلیف پر بھی وہ اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوئے اور انسانوں سے شکایت اور گلے شکوے سے گریزاں رہے، لیکن عام انسان اس صورت میں شکایت، احتجاج، سوء ظن، دشنام، انتقام، بے حسی، بے دردی، یاس، مظلومیت، بے عملی، غرض طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے حوالے سے وہ ناشکری، بے اعتمادی، دوری، حتیٰ کہ الحاد و کفر تک کے مراحل طے کر سکتا ہے۔

اللہ کے پیغمبروں نے پہلے دن ہی سے یہ اطلاع دے رکھی ہے اور اسے ایمان کا لازمی جزو قرار دیا ہوا ہے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے اور یوم جزا و سزا برپا ہونا ہے، جس میں ہر ایک کے لیے اس امتحان کا نتیجہ نکل آئے گا، اور اس نتیجے کے مطابق جزا و سزا بھی دی جائے گی۔

ہمارا یہ ایمان دنیا کی اس زندگی کے بارے میں ہمارے تصور حیات کو بالکل بدل دیتا ہے۔ اصولاً اس کے بعد ہمارا رویہ اور عمل وہی ہونا چاہیے جس کا ذکر اوپر ہم نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کے حوالے سے کیا ہے، یعنی واقعے کو اللہ کی طرف سے آزمایش سمجھے۔ اسی اللہ سے اس آزمایش میں سرخ روئی کے لیے مدد مانگے اور اس آزمایش کی سختی میں نرمی کرنے یا اس سے نجات کی درخواست کرے۔

سورۂ یوسف میں موضوع ہی وہ مشکلات ہیں جو انسانوں کی غلط روی سے کسی انسان کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔

بھائیوں کا معاملہ ہو، زلیخا کی لبھانے اور پھر انتقام لینے کی روش ہو، پھر اقتدار اور خوش حالی کا دور ہو، حضرت یوسف علیہ السلام ستم رسانیوں کا انتقام لینے کے بجاے جس طرح انسانوں کے ساتھ عفو درگذر اور عطا و عنایت کا معاملہ کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ بندگی، شکر اور تفویض کا قالب بن کر جڑے رہتے ہیں، بندۂ مومن کے لیے یہی روش عند اللہ مطلوب ہے۔ سورۂ یوسف میں حضرت یوسف کو اسی بنا پر 'محسن' (خوب کار) قرار دیا گیا ہے۔

جس طرح سورۂ یوسف میں دونوں باپ بیٹے کے 'بندۂ حق پرست' اور 'سپردم بہ تو' ہونے کی تصاویر کھینچی گئی ہیں اور ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ مشکلات میں اللہ کے مقبول بندے کیا رویہ اپناتے ہیں اور کیا اقدامات کرتے ہیں، وہیں یہ نکتہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح یا کسی اور طرح یہ سب کچھ کیوں ہونے دیتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملے میں تو معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک بڑی قوم بنانے کے عمل کا آغاز مقصود تھا۔ اس غرض سے باپ اور بیٹے کو ہجر و وصال کی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا، درآں حالیکہ اس سب کچھ کا آغاز سوتیلے بھائیوں کی اپنی غرض کو حاصل کرنے کی سعی سے ہوا۔

یہ بات قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کی ایک روداد سفر کے واقعات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ کشتی کا ٹوٹنا ہو، بچے کا قتل ہو یا دیوار کی استواری ان سب واقعات میں بھی یہی واضح کیا گیا ہے کہ مقصود ایک خیر کا حصول تھا۔ قرآن مجید نے تکالیف ایوب کا ذکر کر کے اسی نکتے کے کچھ اور پہلوؤں کی پردہ کشائی کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیمار کی عیادت کے موقع پر فرمایا:

لا بأس، طهور إن شاء الله. "کوئی حرج نہیں، یہ اللہ نے چاہا تو ذریعۂ پاکیزگی ہے۔" (بخاری، رقم ۵۶۶۲)

آپ کا یہ ارشاد بھی ظاہری واقعات کے پیچھے موجود الٰہی حکمت کے ایک پہلو کو واضح کرتا ہے۔

ہمارے ساتھ جو بھی واقعات پیش آتے ہیں، خواہ اس کے اسباب کچھ بھی ہوں، ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کے علم اور اذن یا حکم کے بغیر نہیں ہوتے۔ ہمارا امتحان یہ ہے کہ ہم ان واقعات کا سامنا کرتے ہوئے سچے ایمان و عمل صالح پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔ حق شناسی اور حق پرستی کے تقاضے پورے کرتے ہیں یا نہیں۔ اللہ کی بندگی اور انسانوں کے ساتھ معاملات میں فرائض و حقوق کے ادا کرنے میں صحت عمل اور جمال و کمال کے مراتب حاصل کرتے ہیں یا نہیں۔

زندگی کے جور و جفا میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم خدا کی بادشاہی میں جی رہے ہیں۔ علیم و خبیر بادشاہ،

حاضر و ناظر بادشاہ، عزیز و حکیم بادشاہ۔ جس کے عدل کا ترازو ذرہ برابر نیکی ہو یا برائی اسے تول دے گا۔ ہمیں اس میں رائی برابر شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں ہماری سعی و جہد کا پورا پورا اجر ملے گا۔ قرآن مجید نے جس طرح یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے کہ مالک یوم الدین کی عدالت میں سفارش اور رشوت نہیں چلے گی، اسی طرح اس بات کو بھی کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اجر دینے میں رحمٰن کی رحمتیں اور غفار کا عفو و درگذر شامل حال ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کے کمال کرم کا مظہر ہی تو ہے کہ برائی ایک اور نیکی دس شمار ہوتی ہے۔

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الشوریٰ

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةُ
الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢١﴾ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ
رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿٢٢﴾

(خدا کا دین تو وہی ہے جو اُس نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے دیا ہے، پھر) کیا اِن لوگوں نے خدا کے کچھ ایسے شریک بنا رکھے ہیں جنھوں نے اِن کے لیے وہ دین ٹھیرایا ہے جس کا اذن خدا نے نہیں دیا ہے؟ (یہ ایسی جسارت ہے کہ) اگر فیصلے کی بات طے نہ کر دی گئی ہوتی تو اِن کے درمیان اِسی وقت فیصلہ کر دیا جاتا۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جو اِس طرح کے ظالم ہیں، اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ تم اِن ظالموں کو (اُس دن) دیکھو گے کہ اپنی کمائی کے وبال سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ اُن پر پڑ کے رہے گا۔ اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل

ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی ؕ وَمَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

کیے ہوں گے، وہ بہشت کے باغیچوں میں ہوں گے۔[۱۰۱] اُن کے لیے، جو کچھ چاہیں گے، اُن کے پروردگار کے پاس موجود ہوگا۔ بڑا فضل درحقیقت یہی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بشارت اللہ اپنے اُن بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے۔ اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ میں اِس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگ رہا، میں تو بس قرابت کی محبت ہے، جس کا حق ادا کر رہا ہوں۔[۱۰۲] اور کہہ دو کہ جو شخص کوئی نیکی کرے گا تو ہم اُس نیکی میں اُس کے لیے بھلائی کو بڑھا دیں گے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، بڑا قدردان ہے۔[۱۰۳] ۲۱-۲۳

۱۰۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ'۔ اِس میں 'جَنّٰت' بھی جمع ہے اور 'رَوْضٰت' بھی۔ یعنی اہل جنت کے لیے ایک جنت نہیں، کئی جنتیں اور ایک باغیچہ نہیں، کئی باغیچے ہوں گے۔

۱۰۲۔ اصل میں 'اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن میں استثنا ہمارے نزدیک منقطع اور 'قُرْبٰی' مصدر کے مفہوم میں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ قریش کے اِن برخود غلط لیڈروں کو آگاہ کر دو کہ تمھاری تمام ناقدریوں، بے زاریوں اور دل آزاریوں کے باوجود میں اِس طرح جو اپنے رات دن تمھارے پیچھے ایک کیے ہوئے ہوں تو یہ نہ سمجھو کہ اِس میں میری کوئی ذاتی غرض پوشیدہ ہے۔ جس کے لیے خدا کی طرف سے اُس فضل عظیم کی بشارت ہے جس کا ذکر اوپر ہوا، وہ بھلا تم سے کسی صلہ و معاوضہ کا طالب کیا ہو گا! میری یہ ساری سرگرمیاں اور بے قراریاں اِس وجہ سے ہیں کہ میں اُس حق قرابت سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں جو تمھارے اور میرے مابین ہے۔ تم میرے خاندان اور میری قوم کے لوگ ہو، اِس وجہ سے مجھ پر یہ حق ہے کہ جو ہدایت اور آگاہی خدا کی طرف سے میں لے کر آیا ہوں، اُس سے سب سے پہلے تم کو آگاہ کروں اور جس رحمت کی منادی کر رہا ہوں، اُس میں سب سے پہلے تمھیں شریک کرنے کی کوشش کروں۔" (تدبر قرآن ۷/۱۶۵)

۱۰۳۔ مطلب یہ ہے کہ میں جس نیکی کی دعوت دے رہا ہوں، اُس سے میرا یا خدا کا کوئی مفاد وابستہ نہیں

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ۚ فَاِنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یَخۡتِمۡ عَلٰی قَلۡبِکَ ؕ
وَیَمۡحُ اللّٰہُ الۡبَاطِلَ وَیُحِقُّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۲۴﴾

کیا یہ کہتے ہیں کہ اِس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے؟ (ہرگز نہیں، یہ سراسر ہماری عنایت ہے)۔ سو اگر اللہ چاہے تو تمھارے دل پر مہر لگا دے (اور چاہے تو اپنی یہ عنایت جاری رکھے)،[۱۰۴] جب کہ اللہ تو اپنے اِن کلمات کے ذریعے سے باطل کو مٹا رہا اور حق کو ثابت کر رہا ہے۔[۱۰۵] اِس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔ (یہ اُس کی طرف بڑھیں کہ)

ہے، بلکہ سراسر تمھارا نفع ہے۔ اِس لیے نیکی اور خیر کی یہ دعوت قبول کرو۔ تمھارا پروردگار اپنے بندوں کی نیکیوں کی بڑی قدر کرنے والا ہے۔

۱۰۴۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیات ۸۶-۸۷ میں اِس طرح بیان ہوئی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تمھاری طرف وحی کیا ہے، وہ چھین کر لے جائیں، پھر اِس کے لیے تم ہمارے مقابل میں کوئی مددگار نہ پاؤ۔ مگر یہ صرف تمھارے پروردگار کی رحمت ہے کہ تم اِس سے سرفراز ہوئے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا فضل تمھارے اوپر بہت بڑا ہے۔

۱۰۵۔ یہ قرآن کی حقانیت پر استدلال ہے کہ افترا ہمیشہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور شیطان کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ احقاق حق اور ابطال باطل کرے۔ اُس کا کام تو اِس کے بالکل برعکس ہونا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... ذرا مختلف الفاظ میں یہی بات سیدنا مسیح سے اُن لوگوں کے جواب میں منقول ہوئی ہے جو آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ بدروحوں کو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے نکالتے ہیں۔ آپ نے اِن معترضین کو یہ جواب دیا کہ اگر میں نے شیطانوں کو شیطان ہی کی مدد سے نکالا تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ شیطان خود ہی اپنا دشمن بن گیا۔ یہی بات یہاں ارشاد ہوئی کہ اگر یہ کلام افترا اور اِس کا پیش کرنے والا مفتری ہے تو اِس کا اثر احقاق حق اور ابطال باطل کی صورت میں نہیں، بلکہ اِس کے بالکل برعکس نکلنا تھا۔ دنیا میں کس مفتری نے اِس طرح کا فیض بخش اور ارواح و قلوب کو منور کرنے والا کلام پیش کیا ہے، جس طرح کا کلام یہ قرآن ہے!“ (تدبر قرآن ۷/ ۱۶۸)

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا
تَفْعَلُوْنَ ۙ﴿۲۵﴾

وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ
وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا
يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا
قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾

وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور اُن کی برائیوں سے درگذر فرماتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔[۱۰۶] ۲۴-۲۵

ایمان والے اور نیک عمل کرنے والے تو (اُس کی دعوت کو) قبول کرتے ہیں اور (اِس کے صلے میں) وہ اُن پر اپنا مزید فضل فرمائے گا۔ رہے یہ منکرین تو اِن کے لیے سخت عذاب ہے۔ ۲۶

(خدا نے جو کچھ اِنھیں دیا ہے، وہی اِن کے لیے فتنہ بن گیا ہے)۔ اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کو بالکل ہی کھول دیتا تو وہ زمین میں اودھم مچا دیتے۔ مگر وہ ایک حساب کے ساتھ جو چاہتا ہے، اُن کے لیے اتارتا ہے، اِس لیے کہ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، وہ اُن کا نگران حال ہے۔ بلکہ وہی ہے جو اُن کے مایوس ہو جانے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو (ہر طرف) پھیلا دیتا ہے اور وہی (سب کا) کارساز اور ستودہ صفات ہے۔[۱۰۷] ۲۷-۲۸

۱۰۶۔ یعنی جب جانتا ہے تو اُس سے ڈرو، تم اپنا کوئی جرم اُس سے چھپا نہیں سکو گے۔

۱۰۷۔ لہٰذا نہ کسی کو اپنی دولت و ثروت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل سمجھنا چاہیے اور نہ خدا کی عنایتوں کو اپنی قابلیتوں کا حاصل یا اپنے مزعومہ شرکا کی کرشمہ سازی خیال کرنا چاہیے۔ یہ بارش جس پر تمام معیشت کا

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَثَّ فِيۡهِمَا مِنۡ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمۡعِهِمۡ اِذَا يَشَآءُ قَدِيۡرٌ ﴿۲۹﴾

وَمَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ﴿۳۰﴾ ؕ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۖۚ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

(یہ اُس کی وعید کو مذاق نہ سمجھیں)۔ زمین اور آسمانوں کی پیدایش اُسی کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ جان دار بھی جو اُس نے اِن دونوں کے اندر [۱۰۸] پھیلا رکھے ہیں اور وہ اِنھیں اکٹھا کر لینے پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے، جب وہ اِنھیں اکٹھا کرنا چاہے گا۔[۱۰۹] ۲۹

(لوگو، جب خدا سے بغاوت کر دیتے ہو تو دنیا میں بھی) جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے، تمھارے کرتوتوں ہی کی بدولت پہنچتی ہے اور تمھاری بہت سی برائیوں سے وہ درگذر بھی فرماتا ہے۔ (یہ اِس لیے کہ تم اِس سے یاددہانی حاصل کرو)، ورنہ تم روے زمین پر کہیں اُس کے قابو سے باہر نہیں نکل

انحصار ہے، اِس کے لیے آسمان کے بند دریچوں کو وہی کھولتا ہے۔ یہ اُس کے سوا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی اُس کو روک کر وہ لوگوں کو اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

۱۰۸۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ جانور زمین میں چلتے اور پرندے فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی لفظ 'سَمَاء' دوسری بہت سی زبانوں کی طرح اِس معنی کے لیے آتا ہے۔

۱۰۹۔ آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: 'بَثَّ' اور 'جَمۡع'۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"اِس آیت میں 'بَثَّ' اور 'جَمۡع' کا تقابل بھی نہایت بلیغ اور قیامت کی ایک نہایت دل نشین دلیل ہے۔ 'بَثَّ' کے معنی چھٹنے، بکھیرنے اور پھیلانے کے ہیں اور 'جَمۡع' کے معنی اکٹھا کرنے اور سمیٹنے کے۔ اِس سے یہ اشارہ نکلا کہ جس نے زمین اور فضا میں یہ تمام جان دار پھیلائے ہیں، وہ اِن کو، جب چاہے گا، جمع کرنے پر بھی قادر ہے۔ جب وہ اِن کو بکھیرنے پر قادر ہوا تو اُن کو سمیٹنے سے کیوں قاصر رہے گا؟ جو کسان اپنے کھیت میں تخم ریزی کرتا ہے، وہ ضائع کرنے کے لیے تخم نہیں بکھیرتا، بلکہ وہ اُس کا حاصل ایک دن جمع بھی کرتا ہے اور اُس میں اُس کو کوئی زحمت نہیں پیش آتی۔" (تدبر قرآن ۷/ ۱۷۱)

مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ﴿۳۱﴾

وَمِنۡ اٰیٰتِہِ الۡجَوَارِ فِی الۡبَحۡرِ کَالۡاَعۡلَامِ﴿۳۲﴾ اِنۡ یَّشَاۡ یُسۡکِنِ الرِّیۡحَ
فَیَظۡلَلۡنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَہۡرِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ ﴿۳۳﴾ۙ
اَوۡ یُوۡبِقۡہُنَّ بِمَا کَسَبُوۡا وَیَعۡفُ عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۳۴﴾ۙ وَّیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ

سکتے ہو اور اللہ کے مقابل میں نہ تمھارا کوئی کارساز ہوتا ہے، نہ مددگار۔[۱۱۰] ۳۰-۳۱

اور سمندر میں چلنے والے پہاڑوں کی طرح (اونچے) جہاز بھی اُسی کی نشانیوں میں سے ہیں۔[۱۱۱]
اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے، پھر وہ سمندر کی سطح ہی پر ٹھیرے رہ جائیں — اِس میں، یقیناً ہر اُس شخص کے لیے نشانیاں ہیں جو صبر کرنے والا، شکر کرنے والا ہو[۱۱۲] — یا اُن کے اعمال کی پاداش میں اُن کے جہازوں کو تباہ کر دے اور بہتوں سے درگذر فرمائے۔[۱۱۳] اِس لیے تباہ کر دے کہ اُن سے

۱۱۰۔ یہ مخاطبین کی زندگی میں خدا کے قانون مجازات کے ظہور سے استدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجازات کو سمجھنا چاہو تو اپنی روزمرہ زندگی کے تجربات سے بھی سمجھ سکتے ہو۔ پھر یہ کس طرح خیال کرتے ہو کہ اُس نے کامل جزا و سزا کے لیے کوئی دن مقرر نہیں کیا ہے اور تم کو بنا کر تمھارے خیر و شر سے بے نیاز کہیں اطمینان سے کسی گوشے میں بیٹھ گیا ہے؟

۱۱۱۔ یعنی اِس بات کی نشانیاں کہ زندگی کی کشتی خدا کے حکم ہی سے چلتی اور اُسی کے حکم سے، جہاں وہ چاہتا ہے، ٹھیر جاتی ہے اور بارہا اپنے مسافروں کے کرتوتوں کی وجہ سے ڈوب بھی جاتی ہے۔

۱۱۲۔ یعنی اِس حکمت سے بہرہ مند ہو کہ مصیبتیں آ جائیں تو آدمی کو اپنے رب کے بھروسے پر صبر کرنا چاہیے اور نعمتیں ملیں تو اُن پر اترانے کے بجائے اُس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس لیے کہ بندے کو جو کچھ بھی ملتا ہے، خدا ہی کے دیے ملتا ہے اور وہ جس طرح دینے پر قادر ہے، اُسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ جو لوگ اِس حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں، اُن کو نعمت مغرور اور مصیبت مایوس بناتی ہے۔ وہ کبھی ایمان کی حلاوت سے آشنا نہیں ہوتے۔“ (تدبر قرآن ۷/ ۱۷۳)

۱۱۳۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ دنیا میں ضروری نہیں ہے کہ خدا سے سرکشی اختیار کرنے والوں کی ہر غلطی اور گناہ

فِیۡۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَهُمۡ مِّنۡ مَّحِیۡصٍ ﴿۳۵﴾
فَمَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی
لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿ۚ۳۶﴾
وَالَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ ﴿ۚ۳۷﴾

انتقام لے اور اِس لیے کہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کٹ حجتی کر رہے ہیں، وہ جان لیں[۱۱۴] کہ اُن کے لیے کوئی مفر نہیں ہے۔ ۳۲-۳۵

سو جو کچھ تمھیں ملا ہے، (لوگو)، وہ اِس دنیا کی زندگی کی متاع حقیر ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ کہیں بہتر اور پایدار ہے، اُن کے لیے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔[۱۱۵] ۳۶

اور وہ کہ جو بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے بچتے ہیں[۱۱۶] اور جب کبھی غصہ آجائے

پر اُنھیں لازماً سزا مل جائے۔ یہ دنیا اصلاً جزا و سزا کے لیے نہیں، بلکہ امتحان کے لیے بنائی گئی ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ یہاں بہتوں سے درگذر ہی فرماتے ہیں۔ آیت میں جس چیز کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ چشم بصیرت وا ہو تو لوگ مکافات عمل کے نمونے اِس دنیا میں بھی دیکھ سکتے اور اُن سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۱۴۔ اصل میں 'یَعۡلَمَ' ہے اور یہ حالت نصب میں ہے۔ اِس وجہ سے اِس کا معطوف علیہ عربیت کی رو سے محذوف مانا جائے گا۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۱۵۔ یہ الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ آخرت کی ابدی بادشاہی کے طالب ہوں، اُن کے لیے اِس راہ میں اصلی زاد راہ توکل ہے۔ جب تک کسی کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو کہ اِس دنیا کی جو چیزیں خدا کی راہ میں مزاحم ہوں، اُن کو خدا کے بھروسے اور آخرت کے صلے کے اعتماد پر طلاق دے سکے، اُس وقت تک کوئی شخص یہ ابدی بادشاہی حاصل نہیں کر سکتا۔" (تدبر قرآن ۷/۱۷۵)

۱۱۶۔ اصل میں 'اِثۡم' اور 'فَوَاحِش' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'اِثۡم' سے مراد وہ برائیاں ہیں جو حق تلفی

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا

تو ایسے لوگ ہیں کہ درگذر کر جاتے ہیں۔[117] اور وہ کہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی ہے اور نماز کا اہتمام رکھا ہے[118] اور اُن کا نظام اُن کے باہمی مشورے پر مبنی ہے[119] اور ہم نے جو

اور ناانصافی کی نوعیت کی ہوں اور 'فَوَاحِش' کا لفظ اُن برائیوں کے لیے آتا ہے جو شہوت سے پیدا ہوتی ہیں، یعنی زنا، اغلام اور اِن کے متعلقات۔ یہاں اِن برائیوں کے صرف کبائر سے بچتے رہنے کا ذکر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ انسان کی کم زوری کا لحاظ کر کے اُس نے یہ مطالبہ اُس سے نہیں کیا کہ وہ بالکل معصوم ہو کر زندگی گزارے۔ چنانچہ دوسرے مقامات میں بشارت دی ہے کہ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچتا رہے گا تو اُس کی چھوٹی غلطیوں اور کوتاہیوں سے اللہ تعالیٰ درگذر فرمائے گا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... چھوٹی برائیوں سے بچنے کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ آدمی بڑی برائیوں سے اجتناب کرے۔ جو شخص بڑی بڑی امانتیں ادا کرتا ہے، اُس کا ضمیر اِس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ وہ کسی کی چھوٹی سی امانت میں خیانت کر کے خائن کہلانے کا ننگ گوارا کرے۔ اِسی طرح اللہ کا جو بندہ بڑی برائیوں سے اپنے کو بچاتا ہے، وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ چھوٹی چھوٹی برائیوں کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اجر کو برباد کرے۔ جو شخص اشرفیوں کی چوری سے اجتناب کرے گا، وہ دھیلے اور پیسے کی چوری کرنے والا نہیں بنے گا۔ اگر اِس طرح کی کوئی حرکت اُس سے صادر ہو گی بھی تو سہواً ہی ہو گی، عمداً نہیں ہو گی۔ البتہ جو لوگ مچھر کو چھانتے ہیں، اُن کو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اونٹ کو نگل جانے والے ہوتے ہیں۔" (تدبر قرآن ۷/ ۱۷۷)

۱۱۷۔ غصہ اپنی ذات میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ انسان کی حمیت، غیرت اور عزت نفس کا ایک فطری تقاضا ہے۔ تاہم اِسے حدود سے متجاوز نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں اِس کے بارے میں جو ہدایت فرمائی ہے، اُس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے مخالفین اُس زمانے میں جو اشتعال انگیز حرکتیں کر رہے تھے، اُن میں مسلمان کہیں عفو و درگذر کا رویہ نہ چھوڑ دیں۔ چنانچہ آیت میں 'هُمْ' کی ضمیر کا اظہار بھی اِسی مقصد سے اور یہ زور پیدا کرنے کے لیے ہوا ہے کہ اگرچہ یہ کام نہایت کٹھن ہے، مگر استاذ امام کے الفاظ میں، آفرین کے مستحق ہیں وہ لوگ جو یہ کڑوے گھونٹ حلق سے اتارتے ہیں۔

۱۱۸۔ ایمان کی دعوت قبول کرنے کے بعد یہ اُس کے اولین مظہر کا ذکر ہے جو اگر سامنے نہیں آیا تو گویا

رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳۸﴾

رزق اُنھیں عطا فرمایا ہے، اُس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔[۱۲۰] ۳۷-۳۸

ایمان کی دعوت ہی قبول نہیں کی گئی۔ اِس کے اہتمام سے مراد یہ ہے کہ اِسے برقرار رکھا جائے، اِسے پورے آداب کے ساتھ ادا کیا جائے اور اپنے شب و روز میں اِس کی مداومت کی جائے۔ یہی نماز ہے جو ایمان والوں کو منکرات و فواحش سے روکتی اور اجتماعی زندگی میں نظم و اطاعت کے ساتھ رہنے کی تربیت دیتی ہے۔

۱۱۹۔ ہجرت و براءت کے مرحلے میں یہ گویا لطیف اسلوب میں اِس بات کی بشارت ہے کہ مسلمانوں کے لیے اب سیاسی اور اجتماعی ہیئت کی صورت میں منظم ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ یہ ذکر نماز کے بعد کیا گیا ہے اور اِس بات کا اشارہ ہے کہ وہ خدا کے سامنے بھی سرافگندہ رہنے والے ہیں، کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے اور اجتماعی زندگی میں بھی ایک دوسرے پر استبداد کو روا نہیں رکھتے۔ اُن کے ہاں اِس کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ نسب، خاندان، مذہبی حیثیت یا اپنے جتھے کی طاقت کے بل پر کوئی شخص اُن پر مسلط ہونے کی کوشش کرے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا گیا کہ معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اُن کا نظام مشورے پر مبنی ہے۔ اِس کے لیے اصل میں لفظ 'اَمْر' استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ کئی معنوں میں آتا ہے۔ یہاں قرینہ بتا رہا ہے کہ یہ نظم اجتماعی کے مفہوم میں ہے۔ شوریٰ 'فُعْلٰی' کے وزن پر مصدر ہے اور خبر واقع ہوا ہے۔ جملے کی یہ تالیف پیش نظر رہے تو اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ نظم اجتماعی کے لیے اگر کسی سربراہ کے تقرر کا وقت آگیا ہے تو اُس کی امارت مشورے سے منعقد ہو۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں۔ جو کچھ مشورے سے بنے، وہ مشورے سے توڑا بھی جا سکے۔ جس چیز کو وجود میں لانے کے لیے مشورہ لیا جائے، ہر شخص کی راے بالواسطہ یا بلاواسطہ اُس کے وجود کا جزو بنے۔ اجماع و اتفاق سے فیصلہ نہ ہو سکے تو فصل نزاعات کے لیے اکثریت کی راے قبول کر لی جائے۔

۱۲۰۔ نماز کے بعد یہ خدا کی بندگی کا دوسرا ستون ہے۔ نماز بندے کا تعلق اُس کے خالق سے جوڑتی ہے اور یہ خلق سے، اور اِنھی دو ستونوں پر دین کی پوری عمارت قائم ہے۔

ایمان والوں کی یہ تمام صفات جس اسلوب میں اور جس موقع پر گنوائی گئی ہیں، اس میں مخالفین پر جو تعریض ہے، وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ اہل ذوق اُسے محسوس کر سکتے ہیں۔

وَالَّذِيۡنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡىُ هُمۡ يَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا ۚ
فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ انۡتَصَرَ
بَعۡدَ ظُلۡمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ﴿۴۱﴾ ؕ اِنَّمَا السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَظۡلِمُوۡنَ
النَّاسَ وَيَبۡغُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۴۲﴾
وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۳﴾

اور وہ کہ جو بدلہ اُس وقت لیتے ہیں،[۱۲۱] جب اُن پر زیادتی کی جائے۔اِس لیے کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔[۱۲۲] پھر جس نے معاف کیا اور معاملے کی اصلاح کر لی تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ بے شک، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔[۱۲۳] اور ہاں جن پر ظلم ہوا اور اُس کے بعد اُنھوں نے بدلہ لیا تو یہی ہیں جن پر کوئی الزام نہیں ہے۔ الزام تو اُنھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے اور زمین میں بغیر کسی حق کے سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۳۹-۴۲
البتہ جو صبر کریں اور معاف کر دیں تو بے شک، یہی کام ہیں جن کی تاکید کی گئی ہے۔[۱۲۴] ۴۳

۱۲۱۔ اوپر فرمایا ہے کہ جب غصہ آ جائے تو وہ درگذر کر جاتے ہیں۔ یہ اُسی پر استدراک ہے کہ اول تو وہ مخالفین کی تمام تر اشتعال انگیزیوں کے باوجود درگذر کرتے ہیں اور اگر کبھی جواب میں کچھ کہتے یا کرتے بھی ہیں تو اُسی وقت جب اُن پر کوئی صریح زیادتی کی جاتی ہے۔

۱۲۲۔ برائی کے جواب میں جو کچھ کیا جائے، وہ برائی نہیں، بلکہ قصاص ہے، لیکن یہاں اُس کو برائی کے لفظ سے مجانست کے اسلوب پر تعبیر کیا ہے۔ یہ عربی زبان کا معروف اسلوب ہے، جیسے ’دناهم كما دانوا‘۔

۱۲۳۔ یعنی کوئی شخص ظلم کرے تو وہ بھی اللہ کے نزدیک مبغوض ہے اور اُس کے جواب میں اگر ظلم کا جواب اُس سے بڑھ کر ظلم و عدوان سے دیا جائے تو اُس کو بھی اللہ سخت ناپسند کرتا ہے۔

۱۲۴۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ انتقام اور بدلے کے حق کو مان کر عفو و درگذر کی ترغیب دی گئی ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی اولیٰ ہے۔ لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر صبر کی خصلت پیدا کرے۔

[باقی]

علم النبی

جاوید احمد غامدی
ترجمہ و تحقیق: محمد حسن الیاس

قیامت میں شفاعت

— ۱ —

حَدَّثَنَا مَعْبَدُ بْنُ هِلَالٍ الْعَنَزِيُّ، قَالَ: اجْتَمَعْنَا نَاسٌ مِنْ أَهْلِ الْبَصْرَةِ، فَذَهَبْنَا إِلَى أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ[1] وَذَهَبْنَا مَعَنَا بِثَابِتٍ الْبُنَانِيِّ إِلَيْهِ يَسْأَلُهُ لَنَا عَنْ حَدِيثِ الشَّفَاعَةِ، فَإِذَا هُوَ فِي قَصْرِهِ، فَوَافَقْنَاهُ يُصَلِّي الضُّحَى، فَاسْتَأْذَنَّا، فَأَذِنَ لَنَا وَهُوَ قَاعِدٌ عَلَى فِرَاشِهِ، فَقُلْنَا لِثَابِتٍ: لَا تَسْأَلْهُ عَنْ شَيْءٍ أَوَّلَ مِنْ حَدِيثِ الشَّفَاعَةِ، فَقَالَ: يَا أَبَا حَمْزَةَ، هَؤُلَاءِ إِخْوَانُكَ مِنْ أَهْلِ الْبَصْرَةِ جَاءُوكَ يَسْأَلُونَكَ عَنْ حَدِيثِ الشَّفَاعَةِ، فَقَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُهُمْ فِي بَعْضٍ،[2] فَيَأْتُونَ آدَمَ، [فَيَقُولُونَ: يَا آدَمُ، أَنْتَ أَبُو الْبَشَرِ، خَلَقَكَ اللّٰهُ بِيَدِهِ، وَنَفَخَ فِيكَ مِنْ رُوحِهِ][3] فَيَقُولُونَ: اشْفَعْ

لَنَا إِلَى رَبِّكَ، حَتَّى يُرِيحَنَا مِنْ مَكَانِنَا هَذَا، فَيَقُولُ: لَسْتُ لَهَا وَيَذْكُرُ لَهُمْ خَطِيئَتَهُ الَّتِي أَصَابَ، وَلَكِنِ ائْتُوا نُوحًا أَوَّلَ رَسُولٍ بَعَثَهُ اللّٰهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَيَأْتُونَ نُوحًا فَيَقُولُ: إِنِّي لَسْتُ هُنَاكُمْ، وَيَذْكُرُ خَطِيئَتَهُ الَّتِي أَصَابَ،[4] [وَيَقُولُ: عَلَيْكُمْ بِإِبْرَاهِيمَ فَإِنَّهُ خَلِيلُ الرَّحْمَنِ][5] فَيَأْتُونَ إِبْرَاهِيمَ، فَيَقُولُ: لَسْتُ لَهَا وَلَكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُوسَى [أَتَاهُ اللّٰهُ التَّوْرَاةَ][6] فَإِنَّهُ كَلِيمُ اللّٰهِ، فَيَأْتُونَ مُوسَى،[7] فَيَقُولُ: لَسْتُ لَهَا وَلَكِنْ عَلَيْكُمْ بِعِيسَى، فَإِنَّهُ رُوحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ، فَيَأْتُونَ عِيسَى، فَيَقُولُ: لَسْتُ لَهَا وَلَكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَيَأْتُونِي، فَأَقُولُ: أَنَا لَهَا، فَأَسْتَأْذِنُ عَلَى رَبِّي فَيُؤْذَنُ لِي، وَيُلْهِمُنِي مَحَامِدَ أَحْمَدُهُ بِهَا لَا تَحْضُرُنِي الْآنَ،[8] فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا، فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ، ارْفَعْ رَأْسَكَ، وَقُلْ يُسْمَعْ لَكَ، وَسَلْ تُعْطَ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ، فَأَقُولُ: يَا رَبِّ، أُمَّتِي أُمَّتِي،[9] فَيَقُولُ: انْطَلِقْ، فَأَخْرِجْ مِنْهَا مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ شَعِيرَةٍ مِنْ إِيمَانٍ، فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ،[10] ثُمَّ أَعُودُ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ، وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا، فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ، ارْفَعْ رَأْسَكَ، وَقُلْ يُسْمَعْ لَكَ، وَسَلْ تُعْطَ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ، فَأَقُولُ: يَا رَبِّ، أُمَّتِي أُمَّتِي، فَيَقُولُ: انْطَلِقْ، فَأَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ أَوْ خَرْدَلَةٍ مِنْ إِيمَانٍ، فَأَخْرِجْهُ،[11] فَأَنْطَلِقُ فَأَفْعَلُ، ثُمَّ أَعُودُ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ، وَأَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا، فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ، ارْفَعْ

رَأْسَكَ، وَقُلْ يُسْمَعْ لَكَ، وَسَلْ تُعْطَ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ، فَأَقُولُ: يَا رَبِّ، أُمَّتِي أُمَّتِي، فَيُقَالُ: انْطَلِقْ، فَأَخْرِجْ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ أَدْنَى أَدْنَى أَدْنَى مِثْقَالِ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ، فَأَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ،[۱۲] [إِنَّ أَقْوَامًا سَيَخْرُجُونَ مِنَ النَّارِ قَدْ أَصَابَهُمْ سَفْعٌ مِنَ النَّارِ عُقُوبَةً بِذُنُوبٍ عَمِلُوهَا، ثُمَّ لَيُخْرِجَنَّهُمُ اللّٰهُ بِفَضْلِ رَحْمَتِهِ، فَيَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ]،[۱۳] [ثُمَّ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَكَانَ فِي قَلْبِهِ مَا يَزِنُ مِنَ الْخَيْرِ ذَرَّةً]»،[۱۴] [ثُمَّ تَلَا قَتَادَةُ: ﴿**عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا**﴾ قَالَ: هُوَ الْمَقَامُ الْمَحْمُودُ الَّذِي وَعَدَ اللّٰهُ نَبِيَّهُ] .[۱۵]

معبد بن ہلال عنزی بیان کرتے ہیں کہ ہم اہل بصرہ کے چند لوگ اکٹھے ہوئے اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ ہم اُن کے شاگرد ثابت بنانی کو بھی ساتھ لے گئے تاکہ وہ ہمارے لیے شفاعت کی حدیث کے متعلق سوال کریں۔ ہم جب اُن کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ وہ چاشت کی نماز ادا کر رہے ہیں۔ ہم نے دروازے پر اجازت طلب کی تو اُنھوں نے ہمیں اجازت دے دی، اور وہ اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ثابت سے کہا کہ شفاعت کی حدیث کے بارے میں سوال سے پہلے اُن سے کوئی اور سوال نہ کیجیے گا۔ چنانچہ ثابت نے عرض کیا: ابو حمزہ، یہ آپ کے بھائی بصرہ سے آئے ہیں اور آپ سے شفاعت کی حدیث کے متعلق سوال کرنا چاہتے ہیں۔ انس رضی اللہ عنہ نے (اِس کے جواب میں) فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا تھا کہ قیامت کے دن لوگ سخت اضطراب کی حالت میں دریا کی موجوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں گے۔[۱] پھر وہ آدم علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر عرض کریں گے: اے آدم، آپ تمام انسانوں کے والد ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا،[۲] اور آپ میں اپنی روح پھونکی۔ آپ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے شفاعت کیجیے کہ وہ اِس کٹھن مرحلے سے ہمیں نجات دے۔

آدم علیہ السلام فرمائیں گے: میں اِس کا اہل نہیں ہوں، اور اُن کے سامنے اپنی اُس خطا کا ذکر کریں گے، جو اُن سے سرزد ہوئی تھی۔ پھر کہیں گے: ہاں، مگر تم نوح علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ، وہ اللہ کے پہلے رسول ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔

چنانچہ لوگ نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ نوح علیہ السلام فرمائیں گے: یہ میرا منصب نہیں ہے، اور اپنی اُس خطا کا ذکر کریں گے، جو اُن سے سرزد ہوئی اور کہیں گے: تم ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ، اِس لیے کہ وہ رحمٰن کے خلیل ہیں۔ لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ وہ فرمائیں گے: نہیں، میں اِس کے لائق نہیں ہوں، تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، اللہ نے اُنھیں تورات عطا فرمائی تھی، وہ اللہ کے کلیم ہیں۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ بھی اُسی طرح فرمائیں گے: یہ میرا منصب نہیں ہے، تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، اِس لیے کہ وہ اللہ کی روح اور اُس کا کلمہ ہیں۔ چنانچہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ میرا مقام نہیں ہے، اِس کے لیے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے جاؤ۔[3]

اِس کے بعد لوگ میرے پاس آئیں گے اور میں کہوں گا: ہاں، یہ مجھے ہی کرنا ہے۔[4] چنانچہ میں اپنے پروردگار سے اِس کی اجازت طلب کروں گا تو مجھے اجازت دے دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے حمدیہ کلمات الہام فرمائے گا، جن کے ساتھ میں اُس کی حمد و ثنا کروں گا۔ ایسے الفاظ جو مجھے اب یاد نہیں ہیں۔[5] میں اِن کلمات سے اللہ کی حمد بیان کروں گا اور اُس کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔ اُس وقت کہا جائے گا: اے محمد، اپنا سر اٹھاؤ؛ کہو، تمھاری سنی جائے گی؛ مانگو، تمھیں دیا جائے گا؛ شفاعت کرو، تمھاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا: اے میرے رب، میری امت، میری امت![6] اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جاؤ اور جہنم سے اُس کو نکال لو، جس کے دل میں جو کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو۔ لہٰذا میں جا کر یہی کروں گا۔ پھر واپس آ کر میں اِنھی حمدیہ کلمات کے ساتھ اللہ کی حمد و ثنا بیان کروں گا اور دوبارہ سجدہ کروں گا۔ پھر کہا جائے گا: اے محمد، اپنا سر اٹھاؤ؛ کہو، تمھاری سنی جائے گی؛ مانگو، تمھیں دیا جائے گا؛ شفاعت کرو، تمھاری شفاعت قبول کی

جائے گی۔ میں عرض کروں گا: اے میرے رب، میری امت، میری امت! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جاؤاور اُس کو بھی نکال لو، جس کے دل میں ذرہ برابر یا رائی کے دانے کے برابر ایمان ہے۔ میں جا کر ایسا ہی کروں گا۔ پھر میں تیسری بار لوٹوں گا اور اِنھی حمد یہ کلمات کے ساتھ اللہ کی حمد و ثنا بیان کر کے سجدہ کروں گا تو کہا جائے گا: اے محمد، اپنا سر اٹھاؤ؛ کہو، تمھاری سنی جائے گی؛ مانگو، تمھیں دیا جائے گا؛ شفاعت کرو، تمھاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا: اے میرے رب، میری امت، میری امت! کہا جائے گا: جاؤ اور اُسے بھی آگ سے نکال لو، جس کے دل میں رائی کے دانے سے بھی کم تر، بلکہ انتہائی معمولی مقدار میں ایمان ہے۔ اِس کے نتیجے میں بہت سے وہ لوگ بھی آگ سے نکلیں گے، جنھیں اُن کے گناہوں کی وجہ سے آگ کی شدید گرمی کی سزا دی گئی۔[۷] پھر اللہ اُن کو اپنی رحمت سے باہر نکالے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اُس وقت وہ شخص بھی آگ سے نکل آئے گا، جس نے 'لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ' کہا اور اُس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھلائی تھی۔[۸] اِس کے بعد قتادہ نے یہ آیت تلاوت کی: ''امید ہے کہ تمھارا پروردگار تمھیں ایک مقام محمود[۹] پر فائز کرے گا''۔ اُنھوں نے بیان کیا کہ یہی وہ مقام محمود ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے وعدہ فرمایا ہے۔

۱۔ یہ قبروں سے اٹھنے کے بعد اُس مرحلے کا بیان ہے، جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ اُس کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی، لوگوں کے اعمال اُن کے چہروں سے نمایاں ہو رہے ہوں گے، ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہو گا۔ نہ بھائی اپنے بھائی کی فریاد سنے گا، نہ بیٹا ماں باپ کی دہائی پر کان دھرے گا اور نہ بیوی بچوں کو کوئی پوچھنے والا ہو گا۔

۲۔ یہی تعبیر سورۂ ص (۳۸) کی آیت ۷۵ میں آئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے دست قدرت سے تخلیق کیا ہے۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اپنی خلقت کے اعتبار سے انسان فی الواقع خدا کا ایک شاہ کار ہے اور بڑے غیر معمولی اوصاف اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔

۳۔ زمین و آسمان کے خالق کی بارگاہ میں اور اُس کی جلالت کے سامنے یہ پیغمبروں کی طرف سے تواضع، حیا اور اپنی عبودیت کے کامل شعور کا اظہار ہے۔ پھر مزید یہ کہ اُس وقت اُنھیں یہ معلوم بھی نہیں ہو گا کہ قیامت

کے دن کسی کے لیے اِس کی گنجایش بھی ہے کہ بارگاہ الٰہی میں وہ لوگوں کی طرف سے کوئی عرض معروض کر سکتا ہے۔

۴۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ آپ کو دنیا ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ پیغمبروں کی طرف سے معذرت کے بعد یہ شرف آپ ہی کو حاصل ہو گا کہ لوگوں کی طرف سے اُس دن یہ درخواست آپ بارگاہ الٰہی میں پیش کریں۔ تاہم اِس کے لیے لفظ 'شفاعت' سے واضح ہے کہ یہ درخواست اُنھی لوگوں کی طرف سے پیش کی جائے گی جو اگرچہ گناہوں میں مبتلا رہے، لیکن اپنے ایمان کی وجہ سے اُن پر استغفار بھی کرتے رہے۔

۵۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعات غالباً کسی رؤیا میں دکھائے گئے ہوں گے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اُس وقت تو یاد تھے، لیکن اب یاد نہیں رہے۔ اللہ کے نبیوں کو ماضی، حال اور مستقبل کے بعض حقائق بالعموم رؤیا ہی کے ذریعے سے دکھائے جاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ بھی مخاطبۂ الٰہی کی ایک صورت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلوم ہے کہ آپ کے لیے اِس کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی تھی۔ اِس طرح کے خواب بعد میں بھی آپ کو وقتاً فوقتاً دکھائے گئے۔ چنانچہ اِسی نوعیت کے مشاہدات ہیں، جن میں جنت اور جہنم کے دکھائے جانے کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اِن میں سے جو روایتوں میں نقل ہوئے، وہ ہم نے اپنی کتاب ''علم النبی'' میں ''رسول اللہ کے خواب'' کے زیر عنوان ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔

۶۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مرحلے میں جب استحقاق کی بنیاد پر فیصلے سنا دیے جائیں گے اور جنت کے لوگ جنت اور جہنم کے جہنم میں چلے جائیں گے، یہ معاملہ اُس کے بعد ہو گا اور اللہ کے اذن سے آپ اپنی امت کے لیے عفو و درگذر کی درخواست کریں گے۔

۷۔ اِس سے مزید وضاحت ہو گئی ہے کہ عفو و درگذر کا یہ مرحلہ اُس وقت آئے گا، جب لوگ اپنے گناہوں کے لحاظ سے اُن کی سزا کسی حد تک بھگت چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو و درگذر کا یہی مرحلہ ہے، جس کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ اگر کسی نے جانتے بوجھتے شرک نہیں کیا ہے تو اُس کے دوسرے گناہ اللہ اپنے قانون و حکمت کے مطابق، جس کے لیے چاہے گا، معاف فرما دے گا۔ (ملاحظہ ہو: النساء ۴: ۴۸، ۱۱۶)۔ یہ اِسی معافی کا بیان ہے۔ تاہم اِس میں کوئی چیز عدل و انصاف کے خلاف نہیں ہو گی اور پیغمبر کو بھی اِس کی اجازت کہ وہ اِس عفو و درگذر کی تائید میں کوئی درخواست کرنا چاہیں تو کریں، اِس فیصلے کے بعد ہی ملے گی۔ قرآن میں شفاعت کی تعبیر اِسی نوعیت کی درخواست کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ قرآن نے

اِس شفاعت کا اثبات کیا ہے، لیکن اِس کے بارے میں اُن غلط تصورات کی تردید بھی پوری صراحت کے ساتھ کر دی ہے، جو لوگوں نے شفاعت کے بارے میں قائم کر رکھے ہیں اور جن سے خدا کے عدل اور جزا و سزا کے وجوب کی نفی ہوتی ہے۔ ہماری کتاب ''میزان'' میں ''نبی کی شفاعت'' کے زیر عنوان اِس کی تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔ روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اُس کو اُنھی حدود میں سمجھنا چاہیے، جو ہم نے وہاں بیان کیے ہیں، اور اگر کوئی چیز متجاوز محسوس ہو تو اُسے راویوں کے تصرفات سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔

۸۔ اِس میں بنیادی حیثیت، جس طرح کہ سورۂ نساء کی آیات سے واضح ہے، توحید پر ایمان کو حاصل ہے۔ اِس کی وجہ کیا ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... جس طرح تمام خیر کا منبع توحید ہے، یعنی خدا کی ذات، صفات اور اُس کے حقوق میں کسی کو ساجھی نہ ٹھیرانا، اُسی طرح تمام شر کا منبع شرک ہے، یعنی خدا کی ذات، صفات اور اُس کے حقوق میں کسی کو شریک ٹھیرانا۔ توحید پر قائم رہتے ہوئے انسان اگر کوئی ٹھوکر کھاتا ہے تو وہ غلبۂ نفس و جذبات سے اتفاقی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ اِس وجہ سے وہ گرنے کے بعد لازماً اٹھتا ہے۔ برعکس اِس کے شرک کے ساتھ اگر کسی سے کوئی نیکی ہوتی ہے تو وہ اتفاقی ہوتی ہے جس کا اصل منبع خیر، یعنی خدا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اِس وجہ سے وہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ مشرک خدا سے کٹ جانے کی وجہ سے لازماً اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے، اِس وجہ سے وہ درجہ بدرجہ صراط مستقیم سے اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اُس کے لیے خدا کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا تا آنکہ وہ شرک سے توبہ کرے۔ اِس وجہ سے خدا کے ہاں شرک کی معافی نہیں ہے۔ البتہ توحید کے ساتھ اگر کسی سے گناہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا، معاف فرما دے گا۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۸۷)

۹۔ یعنی ایسے مقام پر، جس کی قیامت میں ہر طرف تعریف کی جائے گی۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۶۹۷۵ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل کتب میں نقل ہوئی ہے:

جامع معمر بن راشد، رقم ۱۴۷۹۔ مسند طیالسی، رقم ۲۱۰۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۰۹۹۴، ۳۵۲۵۲۔

مسند احمد، رقم ۱۱۹۲۹، ۱۲۱۶۸، ۱۲۴۲۴، ۱۲۵۸۲، ۱۳۳۰۱، ۱۳۳۲۸۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۱۱۹۴، ۱۲۸۰۔ صحیح بخاری، رقم ۴۱۴۱، ۶۱۰۸، ۶۸۸۵، ۶۹۷۸، ۶۹۷۹، ۶۹۸۵۔ صحیح مسلم، رقم ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۷۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۴۳۱۰۔ مسند بزار، رقم ۶۹۴۷، ۲۱۹۶، ۲۵۲۷۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۰۴۷۰، ۱۰۶۱۸، ۱۰۷۲۹، ۱۰۹۱۷۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۲۸۷۰، ۳۰۲۴، ۴۰۷۰، ۴۰۷۹، ۴۲۸۸۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۳۱۰، ۳۳۰، ۳۳۱۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۶۰۲۔

۲۔ صحیح بخاری، رقم ۷۴۳۹ میں اِس جگہ یہ اضافہ نقل ہوا ہے: 'فَيَقُولُ اللهُ: مَنْ كَانَ يَعْبُدُ شَيْئًا، فَلْيَتَّبِعْهُ...' یعنی ''اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جو جس کی عبادت کرتا تھا، وہ اُس کے پیچھے چلا جائے...'' چنانچہ کچھ لوگ سورج، چاند اور بتوں کے پیچھے ہو جائیں گے۔ صرف وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جو اللہ کی پرستش کرتے تھے، جن میں بعض منافقین بھی شامل ہوں گے۔

۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۰۹۹۴۔ مسند طیالسی، رقم ۲۱۰۹ میں اِس جگہ یہ اضافہ نقل ہوا ہے: 'أَنْتَ أَبُو النَّاسِ، خَلَقَكَ اللهُ بِيَدِهِ، وَأَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهُ، وَعَلَّمَكَ أَسْمَاءَ كُلِّ شَيْءٍ' ''اے آدم، آپ انسانوں کے باپ ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کو سجدہ کریں اور آپ کو ہر چیز کے نام سکھائے''۔

۴۔ سیدنا نوح علیہ السلام سے جو خطا سرزد ہونے کا ذکر ہے، اُس کی کوئی صراحت روایات میں موجود نہیں، البتہ بعض شارحین نے اِسے اُن کی جانب سے اپنے بیٹے کی نجات کے لیے کی گئی دعا پر محمول کیا ہے۔ ابن حجر نے لکھا ہے: 'وَخَطِيئَتُهُ الَّتِي ذَكَرَهَا أَكْثَرُ الْعُلَمَاءِ أَنَّهُ سَأَلَ اللهَ فِي ابْنِهِ وَكَانَ غَيْرَ صَالِحٍ' ''اور وہ خطا جس کا ذکر اکثر علما نے کیا ہے، یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے بیٹے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی، درآں حالیکہ وہ (بیٹا) صالح نہیں تھا'' (فتح الباری ۶/ ۴۹۳)۔

۵۔ مسند طیالسی، رقم ۲۱۰۹۔

۶۔ مسند طیالسی، رقم ۲۱۰۹۔ مسند احمد، رقم ۱۳۳۰۱ میں سیدنا موسیٰ کا یہ تبصرہ بھی نقل ہوا ہے کہ 'وَيَذْكُرُ خَطِيئَتَهُ الَّتِي أَصَابَ: قَتْلَهُ الرَّجُلَ' ''اور (موسیٰ علیہ السلام) اپنی اُس خطا کو یاد کریں گے، جو اُن سے سرزد ہوئی تھی، یعنی اُن کا ایک آدمی کو قتل کر دینا''۔ صحیح بخاری، رقم ۴۷۱۲ میں اِس جگہ سیدنا موسیٰ کی نسبت سے کچھ مزید باتیں بھی نقل ہوئی ہیں۔ روایت کے الفاظ ہیں: 'يَقُولُونَ: يَا مُوسَى، اصْطَفَاكَ اللهُ عَلَى

النَّاسِ بِرِسَالَاتِهِ وَبِكَلَامِهِ، فَاشْفَعْ لَنَا إِلَى رَبِّكَ، أَلَا تَرَى مَا نَحْنُ فِيهِ؟ فَيَقُولُ: إِنَّ رَبِّي قَدْ غَضِبَ الْيَوْمَ غَضَبًا لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ، وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ، وَإِنِّي قَدْ قَتَلْتُ نَفْسًا لَمْ أُومَرْ بِقَتْلِهَا، نَفْسِي نَفْسِي، اذْهَبُوا إِلَى عِيسَى عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَكَلِمَتِهِ وَرُوحِهِ‘ ’’وہ کہیں گے: اے موسیٰ، اللہ نے آپ کو اپنے پیغامات اور کلام کے ذریعے سے لوگوں پر فضیلت دی، ہمارے لیے اپنے رب سے شفاعت کیجیے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہم کس حال میں ہیں؟ اِس کے جواب میں وہ کہیں گے: بے شک، آج میرا رب ایسا غضب ناک ہے، جیسا اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ بعد میں ہوگا، اور میں نے ایک جان کو قتل کیا، جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ میری ذات، میری ذات، تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، جو اللہ کے بندے، اُس کے رسول، اُس کا کلمہ اور اُس کی روح ہیں‘‘۔

۷۔ صحیح بخاری، رقم ۶۵۷۳ میں اِس موقع پر یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں: ’فَتَكُونُ دَعْوَى الرُّسُلِ يَوْمَئِذٍ: اللَّهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ‘، یعنی ’’اس دن تمام انبیا کی دعا یہی ہو گی: اے اللہ، سلامتی عطا فرما، سلامتی عطا فرما۔‘‘ یہ قیامت کے ہیبت ناک منظر کی شدت اور انبیا کی طرف سے عبودیت کے غیر معمولی شعور کا مظہر ہے۔

۸۔ مسند احمد، رقم ۱۲۵۸۲ اور صحیح مسلم، رقم ۱۹۳ میں یہ اضافہ آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ حمد و ثنا کے کلمات الہام کرے گا۔ روایت کے الفاظ ہیں: ’وَيُلْهِمُنِي اللّٰهُ مِنْ مَحَامِدِهِ مَا لَمْ يُفْتَحْ عَلَى أَحَدٍ مِنْ قَبْلِي‘ ’’اللہ تعالیٰ مجھے اپنی حمد کے ایسے اسالیب سکھائے گا، جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوئے‘‘۔

۹۔ صحیح مسلم، رقم ۱۹۳ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ’يَا رَبِّ، أُمَّتِي أُمَّتِي‘ کی تکرار منقول ہے۔

۱۰۔ صحیح بخاری، رقم ۷۴۳۹ اور صحیح مسلم، رقم ۱۸۲ میں اِس مقام پر یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ موحدین کو سجدے کے نشان سے پہچانا جائے گا۔ روایت کے الفاظ ہیں: ’فَتُحَرِّمُ النَّارُ عَلَى مَوَاضِعِ السُّجُودِ، فَيَخْرُجُونَ وَقَدْ احْتَرَقُوا إِلَّا مَوَاضِعَ السُّجُودِ...‘ یعنی ’’اللہ تعالیٰ نے جہنم پر سجدے کے مقامات کو حرام قرار دیا ہوگا۔ وہ لوگ نکلیں گے، اس حال میں کہ اُن کے جسم جل چکے ہوں گے، مگر سجدے کے مقامات سلامت ہوں گے...۔‘‘

۱۱۔ مسند طیالسی، رقم ۲۱۰۹ میں اِس جگہ یہ اضافہ نقل ہوا ہے: ’ثُمَّ أَشْفَعُ فَيَحُدُّ لِي حَدًّا، فَأُدْخِلُهُمْ

الْجَنَّةَ حَتَّى أَرْجِعَ، فَأَقُولُ: "يَا رَبِّ، مَا بَقِيَ فِي النَّارِ إِلا مَنْ حَبَسَهُ الْقُرْآنُ"، أَيْ وَجَبَ عَلَيْهِ الْخُلُودُ،' 'پھر میں سفارش کروں گا، تو میرے لیے ایک حد مقرر کی جائے گی، لہٰذا میں اُنھیں جنت میں داخل کردوں گا، یہاں تک کہ میں لوٹوں گا، پھر میں کہوں گا: اے میرے رب، اب جہنم میں صرف وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں، جنھیں قرآن نے روک رکھا ہے، یعنی جن پر (قرآن کی رو سے) جہنم میں ہمیشہ رہنا واجب ہو چکا ہے۔"

۱۲۔ صحیح بخاری، رقم ۷۴۳۹ اور صحیح مسلم، رقم ۱۹۰ میں اِس مقام پر یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں: 'فَيُنْبَتُونَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِي حَمِيلِ السَّيْلِ...' یعنی "پھر وہ ایسے اگیں گے، جیسے بیج کسی سیلاب کے کنارے اگتا ہے۔" اس سے مراد یہ ہے کہ جہنم سے نکلنے والے لوگ آبِ حیات کے ذریعے سے دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، جیسے زمین پر نئی کونپلیں نکلتی ہیں۔ اِسی روایت میں اِس مقام پر یہ اضافہ بھی نقل ہوا ہے: 'قَدْ أَكَلَتْهُمُ النَّارُ إِلَّا دَارَةَ وَجْهِهِ'، یعنی آگ نے اُن کے جسموں کو جلا دیا ہو گا، سوائے چہرے کے دائرے کے، جو محفوظ رہا ہو گا۔ صحیح بخاری، رقم ۷۴۳۹ میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ 'فَيُحَرِّمُ اللهُ عَلَى النَّارِ أَنْ تَأْكُلَ مِنِ ابْنِ آدَمَ أَثَرَ السُّجُودِ...'، یعنی "اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ پر ابن آدم کے اُن اعضا کو کھانا حرام کر دے گا، جن پر سجدے کے نشانات ہوں گے...۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کو سجدے کے اثرات کی بنا پر جہنم سے پہچانا جائے گا اور وہ محفوظ رہیں گے، اگرچہ اُن کے جسم کے دوسرے حصے جل چکے ہوں گے۔ یہ نجات کا ایک ظاہری نشان ہو گا، جو خالص عبادت اور بندگی سے نمایاں ہو گا۔

۱۳۔ صحیح بخاری، رقم ۶۸۸۵۔

۱۴۔ مسند احمد، رقم ۱۳۳۰۱۔

۱۵۔ صحیح بخاری، رقم ۶۵۷۳ میں اِس مقام پر یہ واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ایک شخص جو دوزخ میں سب سے آخر میں باقی رہ جاتا ہے، وہ اپنے رب سے عرض کرتا ہے: 'يَا رَبِّ، اصْرِفْ وَجْهِي عَنِ النَّارِ...' "اے میرے رب، میرا چہرہ دوزخ سے پھیر دے...۔" پھر بار بار کے وعدوں، انکار اور نرمی کے بعد اللہ تعالیٰ اُس پر ہنس دیتے ہیں اور اُسے جنت میں داخل فرما دیتے ہیں۔ آخر میں فرمایا جاتا ہے: 'اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ، فَإِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشَرَةَ أَمْثَالِهَا'، یعنی "جا، جنت میں داخل ہو جا، تیرے لیے دنیا جیسا اور اُس سے دس گنا زیادہ اجر ہے۔" مسند احمد، رقم ۱۲۵۸۲ میں یہی مضمون کچھ مختلف پس منظر کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: حَدَّثَنِي نَبِيُّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنِّي لَقَائِمٌ أَنْتَظِرُ أُمَّتِي تَعْبُرُ عَلَى الصِّرَاطِ، إِذْ جَاءَنِي عِيسَى، فَقَالَ: هَذِهِ الْأَنْبِيَاءُ قَدْ جَاءَتْكَ يَامُحَمَّدُ يَسْأَلُونَ أَوْ قَالَ: يَجْتَمِعُونَ إِلَيْكَ، وَيَدْعُونَ اللهَ أَنْ يُفَرِّقَ جَمْعَ الْأُمَمِ إِلَى حَيْثُ يَشَاءُ اللهُ لِغَمِّ مَا هُمْ فِيهِ، فالْخَلْقُ مُلْجَمُونَ فِي الْعَرَقِ، فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَهُوَ عَلَيْهِ كَالزَّكْمَةِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيَتَغَشَّاهُ الْمَوْتُ» قَالَ: «قَالَ عِيسَى: انْتَظِرْ حَتَّى أَرْجِعَ إِلَيْكَ» قَالَ: فَذَهَبَ نَبِيُّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى قَامَ تَحْتَ الْعَرْشِ، فَلَقِيَ مَا لَمْ يَلْقَ مَلَكٌ مُصْطَفًى، وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ، فَأَوْحَى اللهُ إِلَى جِبْرِيلَ: اذْهَبْ إِلَى مُحَمَّدٍ، فَقُلْ لَهُ ارْفَعْ رَأْسَكَ، سَلْ تُعْطَ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ قَالَ: «فَشُفِّعْتُ فِي أُمَّتِي أَنْ أُخْرِجَ مِنْ كُلِّ تِسْعَةٍ وَتِسْعِينَ إِنْسَانًا، وَاحِدًا» قَالَ: «فَمَا زِلْتُ أَتَرَدَّدُ عَلَى رَبِّي، فَلَا أَقُومُ مَقَامًا إِلَّا شُفِّعْتُ، حَتَّى أَعْطَانِي اللهُ مِنْ ذَلِكَ أَنْ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ، أَدْخِلْ مِنْ أُمَّتِكَ مِنْ خَلْقِ اللهِ مَنْ شَهِدَ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ يَوْمًا وَاحِدًا مُخْلِصًا، وَمَاتَ عَلَى ذَلِكَ».

”انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک، میں قیامت کے دن کھڑا اپنی امت کا انتظار کر رہا ہوں گا، جب وہ صراط پر سے گزر رہی ہو گی، اِسی دوران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے محمد، یہ تمام انبیا آپ کے پاس حاضر ہو چکے ہیں۔ وہ آپ سے سوال کرتے ہیں یا (یوں فرمایا) کہ وہ آپ کے پاس جمع ہو گئے ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں کہ امتوں کی اِس بھیڑ کو، اُس سخت غم و اضطراب کی وجہ سے، جس میں وہ مبتلا ہیں، جہاں چاہے متفرق کر دے۔ اُس وقت تمام مخلوق پسینے میں ڈوبی ہوئی ہو گی۔ سو مومن کے لیے پسینہ ایسی کیفیت رکھے گا، جیسے زکام کی ہلکی سی حالت ہوتی ہے، اور کافر پر پسینہ موت کی طرح چھا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے: آپ یہیں ٹھیریے، یہاں میرا انتظار کیجیے، یہاں تک کہ میں آپ کے پاس واپس آؤں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم عرش کے نیچے کھڑے ہو جائیں گے، اور وہاں آپ کو وہ مقام عطا ہو گا جو نہ کسی برگزیدہ فرشتے کو ملا ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ جبریل علیہ السلام کو وحی فرمائے گا کہ جاؤ، محمد کے پاس، اور اُن سے کہو: اپنا سر اٹھاؤ؛ سوال کرو، تمھیں عطا کیا جائے گا اور سفارش کرو، تمھاری سفارش قبول کی جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اُس وقت میں اپنی امت کے بارے میں سفارش کروں گا کہ ہر ننانوے

انسانوں میں سے ایک آدمی کو نکالا جائے۔ پھر میں بار بار اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوتا رہوں گا اور کسی مرتبہ ایسا نہ ہو گا، جس میں میں کھڑا ہوں اور سفارش نہ کروں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ شرف عطا فرمائے گا: اے محمد، اپنی امت میں سے اللہ کی مخلوق میں سے ہر اُس شخص کو جنت میں داخل کر لو، جس نے اخلاص کے ساتھ ایک دن بھی 'لا إلٰه إلا الله' کی گواہی دی ہو اور اسی حالت پر دنیا سے رخصت ہوا ہو۔"

المصادر والمراجع

ابن حبان، أبو حاتم بن حبان. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر، على بن حجر أبو الفضل العسقلاني. (١٣٧٩هـ). **فتح الباري شرح صحيح البخاري**. (د.ط). تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار المعرفة.

ابن قانع، ابوالحسين عبد الباقى. (١٤٨١هـ/١٩٩٨م). **معجم الصحابة**. ط١. تحقيق:حمدي محمد. مكة المكرمة: نزار مصطفى الباز.

ابن ماجة، ابو عبد الله محمد بن يزيد القزويني. (د.ت). **سنن ابن ماجة**. ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار الفكر.

ابن منظور، محمد بن مكرم بن الأفريقي. (د.ت). **لسان العرب**. ط١. بيروت: دار صادر.

أبو نعيم، احمد بن عبد الله اصفهانى (د.ت). **معرفة الصحابة**. ط١. تحقيق: مسعد السعدني. بيروت: دارالكتاب العلمية.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (د.ت). **مسند أحمد بن حنبل**. ط١. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البخاري، محمد بن إسمٰعيل. (١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م). **الجامع الصحيح**. ط٣. تحقيق: مصطفى ديب البغا. بيروت: دار ابن كثير.

بدر الدين العيني ابو محمد محمود بن احمد. **عمدة القاري شرح صحيح البخاري**. (د.ط). بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البيهقي، أحمد بن الحسين البيهقي. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبرى**. ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

السيوطي، جلال الدين عبد الرحمٰن بن ابوبكر السيوطي. (١٤١٦هـ/ ١٩٩٦م). **الديباج على صحيح**

مسلم بن الحجاج. ط١. تحقيق: أبو إسحٰق الحويني الأثري. السعودية: دار ابن عفان للنشر والتوزيع.

الشاشي، الهيثم بن كليب. (١٤١٠هـ). **مسند الشاشي**. ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

محمد القضاعي الكلبي المزي. (١٤٠٠هـ/١٩٨٠م). **تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط١. تحقيق: بشار عواد معروف. بيروت: مؤسسة الرسالة.

مسلم، مسلم بن الحجاج. (د.ت). **الجامع الصحيح**. ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **السنن الصغرى**. ط٢. تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة. حلب: مكتب المطبوعات الإسلامية.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرى**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

معارف نبوی

سیرۃ النبی

جاوید احمد غامدی

ترجمہ و تحقیق: محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز

آخری سالوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی میں تیزی

—۱—

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ[1] أَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى تَابَعَ عَلَى رَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الوَحْيَ قَبْلَ وَفَاتِهِ، حَتَّى تَوَفَّاهُ أَكْثَرَ مَا كَانَ الوَحْيُ، ثُمَّ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدُ.

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر (اُن کے زمانۂ نبوت میں) مسلسل وحی نازل کرتا رہا، یہاں تک کہ آپ کے آخری سالوں میں تو وحی نہایت کثرت سے نازل ہوئی۔[1] پھر اِس کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔

۱۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید میں بیانِ شریعت، تزکیہ و تطہیر اور منکرین حق کے خلاف اقدام کی

سورتیں زیادہ تر اِسی آخری زمانے میں نازل ہوئی ہیں۔

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۴۹۸۲ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے تنہا راوی انس رضی اللہ عنہ ہیں، اور اِس کے متابعات اِن مصادر میں دیکھے جا سکتے ہیں:

مسند احمد، رقم ۱۳۴۷۹۔ صحیح مسلم، رقم ۳۰۱۶۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۷۹۲۹۔ المعجم، ابو یعلیٰ، رقم ۳۲۱۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۷/ ۱۳۳۔

اِس روایت کا کوئی شاہد نہیں ہے۔

المصادر و المراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (١٤٢٧هـ/٢٠٠٦م). **العلل**. ط ١. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/ سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (١٢٧١هـ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط ١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠هـ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط ١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط ٣. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧هـ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط ١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: لبنان. مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط ١. تحقيق: د.

عاصم بن عبد الله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤هـ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط ١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن عدي عبد الله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨هـ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط ١. تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠هـ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط ٢. تحقيق: عبد القيوم عبد رب النبي. مكة المكرمة: المكتبة الامدادية.

ابن المِبْرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط ١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت: دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط ٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩هـ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط ١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

أبو اسحاق الحويني. (١٤٣٣هـ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط ١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣هـ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط ١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابو يعلى احمد بن على. (١٤٠٧هـ). **المعجم**. ط ١. تحقيق: ارشاد الحق الأثري. فيصل آباد: إدارة العلوم الأثرية.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢ھ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٠٨ھ/١٩٨٨م). **العلل و معرفة الرجال**. ط ١. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. بيروت: المكتب الإسلامي. الرياض: دار الخاني.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (د.ت). **مسند أحمد بن حنبل**. ط١. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت: دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧ھ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط ١. حلب. القاهرة: دار الوعي مكتبة دار التراث.

البخاري محمد بن إسمٰعيل. (١٤٢٢ھ). **الجامع الصحيح**. ط ١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٠٥ھ).**دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط ١. بيروت: دار الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠ھ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط ١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥ھ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط ١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض. دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣ھ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط ١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧ھ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط ٢. تحقيق: حماد بن محمد الانصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط ١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة. دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط ١. تحقيق: يحيى شفيق حسن. بيروت. دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط ١ . المحقق: صبحي السامرائي. بيروت. عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط ١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة: مكتبة الدار.

مسلم بن الحجاج النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د. ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط ١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

النسائي أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرى**. ط ١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

محمد وسیم اختر مفتی

السابقون الاولون من الانصار

(۷)

[”سیر و سوانح“ کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ

سلسلۂ نسب

حضرت رافع بن مالک کا تعلق بنو خزرج کی شاخ بنو زریق سے تھا۔ بنو عجلان بن عمروان کے دادا، زریق بن عامر پانچویں اور خزرج بن حارثہ دسویں (ابن ہشام) یا گیارھویں (ابن اثیر) جد تھے۔ ان کی والدہ ماویہ بنت عجلان بھی خزرج سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت رافع بن مالک کی کنیت ابو مالک اور ابو رفاعہ تھی۔ اپنے قبیلہ بنو زریق کی نسبت سے زرقی کہلاتے تھے۔

”ویکیبیدیا الموسوعۃ الحرۃ“ کے مضمون میں حضرت رافع کو مالک بن عجلان خزرجی کا بیٹا بتایا گیا ہے۔ یہ بات درست نہیں، کیونکہ حضرت رافع خزرج کی شاخ بنو زریق سے تعلق رکھتے تھے، جب کہ مالک بن عجلان، رئیس خزرج جو یثرب کے —— نو بیاہتا دلہنوں کو نشانہ بنانے والے —— عیاش یہودی بادشاہ فطیون کو قتل کر کے

شام بھاگ گیا تھا، خزرج کی دوسری شاخ بنو سالم بن عوف سے تھا۔ بیعت عقبۂ ثانیہ میں حضرت رافع کے ساتھی، غزوۂ احد میں ان کے ساتھ شہادت پانے والے حضرت عباس بن عبادہ اسی مالک بن عجلان کے پر پوتے تھے (جمہرۃ انساب العرب، ابن حزم ۳۵۳)۔

جاہلیت کے کامل، اسلام کے السابق

حضرت رافع زمانۂ جاہلیت کے کاملین میں شمار ہوتے تھے۔ جو صاحب شرف و نسب جوان عربی لکھنے کی صلاحیت رکھتا، تیراکی میں ماہر ہوتا، اچھا نیزہ انداز ہوتا، حساب میں طاق ہوتا، دلیر و شجاع ہوتا، شعری صلاحیت رکھتا تو عرب اسے 'مرد کامل' کہتے۔

کاملین کا لقب جن اصحاب مروت نے پایا، ان کا شمار اس طرح ہے:

حضرت سعد بن عبادہ، سید خزرج۔ غریبوں کو کھلاتے، اسلام لانے کے بعد اصحاب صفہ ان کے دستر خوان سے فیض یاب ہوتے۔

حضرت رافع بن مالک زرقی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عقبہ کی رات تک مکہ میں نازل ہوا قرآن عطا کیا۔

ربیع بن زیاد عبسی۔ شاہ نعمان بن منذر کا مصاحب رہا۔ شعراے جاہلیت میں سے تھا۔

حضرت اسید بن حضیر۔ جاہلیت کے کامل، عہد اسلامی میں بنو عبدالاشہل کے نقیب۔

حضرت اوس بن خولی۔ حضرت علی اور حضرت فضل بن عباس کے ساتھ مل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیا اور قبر مبارک میں اترے۔

حضرت سوید بن صامت۔ شرف و نسب اور گہری سوجھ بوجھ کے حامل تھے، شعر بھی کہتے تھے۔

قبول اسلام

۱۱/ نبوی کے حج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی گھاٹی میں تشریف فرما تھے کہ یثرب کے قبیلۂ خزرج کے چھ آدمیوں سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آپ نے قرآن مجید کی تلاوت کر کے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ کلام الٰہی سن کر وہ بے حد متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمارے ہم سایہ یہودی جن خاتم النبیین کی آمد کی خبر دے کر ہمیں دھمکاتے ہیں، یہی ہیں۔ چنانچہ سب آپ کے دست مبارک پر ایمان لے آئے، ان السابقون کے نام یہ ہیں:

بنو زریق کے حضرت رافع بن مالک، بنو نجار کے حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت عوف بن عفراء، بنو سلمہ کے حضرت قطبہ بن عامر، بنو حرام کے حضرت عقبہ بن عامر اور بنو عبید بن عدی کے حضرت جابر بن عبداللہ بن رئاب۔ یثرب جا کر انھوں نے اپنے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دی۔

عروہ بن زبیر اور ابن سعد نے یثرب کے السابقون الاولون کی تعداد آٹھ بتائی ہے: حضرت رافع بن مالک، حضرت معاذ بن عفراء، حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت یزید بن ثعلبہ، حضرت ابوالہیثم بن تیہان اور حضرت عویم بن ساعدہ (مستدرک حاکم، رقم ۵۲۴۹)۔

تیسری روایت کے مطابق حضرت رافع بن مالک اور ان کے خالہ زاد بھائی حضرت معاذ بن عفراء عمرہ کرنے مکہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درخت کے نیچے تشریف فرما پایا۔ بیت اللہ کا طواف کر کے وہ آپ کے پاس چلے آئے اور سلام کر کے پوچھا: وہ شخص کہاں ہے جو دعواے نبوت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں ہی ہوں۔ ان کے سوالات کے جواب میں آپ نے اسلام کی تعلیمات بیان فرمائیں۔ ارشاد کیا: اللہ جو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کا خالق ہے، عبادت کا حق رکھتا ہے، نہ کہ اس کی مخلوق، اس لیے تم پر واجب ہے کہ اپنے رب کی بندگی کرو۔ انھوں نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا تو آپ نے ان کو سورۂ یوسف اور سورۂ علق سکھائیں (طبقات ابن سعد، رقم ۱۶۱۔ مستدرک حاکم ۴/ ۱۴۹۔ البدایۃ والنہایۃ ۳/ ۳۹۹)۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں: یہ واقعہ چھ یا آٹھ انصار کی سبقت الی الایمان سے قبل پیش آیا۔ محمد بن عمر کہتے ہیں: ہمارے نزدیک پہلی روایت قوی اور مستند ہے جس میں چھ السابقون کے بیعت ایمان کرنے کا ذکر ہے۔

بیعت عقبۂ اولیٰ

۱۲/ نبوی (جولائی ۶۲۱ء) کے حج میں یثرب کے بارہ اصحاب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی۔ ۱۱/ نبوی کی بیعت میں شامل پانچ اصحاب حضرت رافع بن مالک، حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت عوف بن عفراء، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت قطبہ بن عامر کے ساتھ سات مزید اہل ایمان بھی اس بیعت میں شامل ہوئے، ان کے نام ہیں: حضرت معاذ یا حضرت معوذ بن عفراء، حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت یزید بن ثعلبہ، حضرت عباس بن عبادہ، حضرت ابوالہیثم بن تیہان اور حضرت عویم بن ساعدہ۔ حضرت ابوالہیثم اور حضرت عویم اوس سے تھے، جب کہ باقی دس صحابہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ مکہ سے منیٰ آتے ہوئے کوہ ثبیر کی ایک گھاٹی (عربی: عقبہ) سے گزرنا پڑتا ہے۔ جمرۂ اولیٰ یا جمرۂ عقبہ یہیں واقع ہے، جب کہ

باقی دو جمرے اور منیٰ کا میدان مشرق کی سمت میں ہیں۔ رمی جمرات کے بعد حاجیوں کا ہجوم یہاں سے چھٹ جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لینے کے لیے اس گھاٹی یا عقبہ کو منتخب فرمایا۔اس لیے انصار کے ان بارہ السابقون الاولون کی بیعت ایمان کو بیعت عقبۂ اولیٰ کہا جاتا ہے۔

مدینہ میں اشاعت اسلام

حضرت رافع بن مالک نے اپنے شہر پہنچ کر اشاعت اسلام میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ مدینہ میں بنوزریق کی مسجد میں سب سے پہلے قرآن مجید پڑھا گیا،اس کے پڑھنے والے حضرت رافع تھے۔ سورۂ یوسف مدینہ میں انھوں نے پہنچائی۔ بیعت عقبۂ اولیٰ سے واپسی کے وقت جس قدر قرآن نازل ہوا تھا، لکھ کر ساتھ لیتے آئے اور اپنی قوم کو جمع کر کے سنایا۔ایک روایت کے مطابق حضرت رافع مکہ میں تھے،جب سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی،اسے لکھ کر مدینہ لے آئے اور اپنے اہل قبیلہ کو سنائی۔ان کی دعوت کے نتیجے میں مدینہ میں اسلام پھیل گیا،اب کوئی گھر نہ تھا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر نہ ہوتا تھا۔

کتابت وحی

اسلام کے ابتدائی دور میں حضرت ابوبکر کے فوراً بعد ایمان لانے والے حضرت خالد بن سعید نے آیت بسملہ کی کتابت کی (الاصابہ فی تمییز الصحابہ، رقم ۲۱۶۹)۔ پھر حضرت عبداللہ بن سعد بن ابوالسرح کو کتابت وحی کی ذمہ داری ملی، لیکن ہجرت کے بعد وہ مرتد ہو کر مشرکین مکہ سے جا ملے۔ فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قتل کا حکم صادر کر رکھا تھا، لیکن ان کے رضاعی بھائی حضرت عثمان کی درخواست پر انھیں معافی مل گئی اور انھوں نے اسلام کی طرف رجوع کر لیا۔مکہ میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان بھی قرآن کی کتابت کرتے رہے۔ بیعت عقبۂ اولیٰ کے وقت حضرت رافع بن مالک کو قرآن مجید کی کتابت کرنے والے اولیں صحابہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ زندگی مہلت دیتی تو کاتبین وحی میں ان کا اہم مقام ہوتا۔

بیعت عقبۂ ثانیہ

۱۳/ نبوی (جون ۶۲۲ء) کے موسم حج میں یثرب کے پچھتر مسلمان اپنے مشرک اہل وطن کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے نکلے۔انھوں نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے پہاڑوں میں

پریشان و خائف نہ رہنے دیا جائے، بلکہ آپ کو یثرب منتقل ہونے کی دعوت دی جائے۔ مکہ پہنچ کر انھوں نے آپ سے رابطہ کیا تو ایام تشریق کی درمیانی رات، ۱۲/ ذی الحجہ کو منیٰ میں جمرۂ عقبہ کی گھاٹی میں خفیہ طور پر جمع ہونے کا فیصلہ ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا: سوئے ہوئے کو بیدار کیا جائے، نہ غیر موجود کا انتظار کیا جائے۔ جب رات پر سکون ہو گئی تو دو صحابیات اور تہتر صحابہ چھپتے چھپاتے نکلے اور سست روی سے عقبہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا جناب عباس کے ساتھ موجود تھے۔ سب سے پہلے حضرت رافع بن مالک زرقی کی نگاہ آپ پر پڑی۔

جناب عباس نے اہل یثرب سے مرتے دم تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کی ضمانت چاہی تو ان کی طرف سے حضرت براء بن عازب اور حضرت اسعد بن زرارہ نے پر جوش ہو کر کہا: ہم مال کی تباہی اور اشراف کے قتل کا خطرہ مول لے کر آپ کا ساتھ دیں گے۔

آپ نے قرآن مجید کی آیات تلاوت فرمائیں، اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی اور اسلام کی رغبت دلائی۔ پھر فرمایا: اپنے رب کے لیے میرا مطالبہ ہے کہ اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ اور اپنے لیے اور اپنے صحابہ کے لیے مانگتا ہوں کہ ہمیں پناہ دو، ہماری نصرت کرو اور ان معاملات میں ہمارا دفاع کرو جن میں اپنا کرتے ہو۔ حاضرین انصار نے پوچھا: ہم نے ایسا کر لیا تو ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا: تمھارے لیے جنت ہو گی (صحیح ابن حبان، رقم ۶۲۷۴)۔ پھر بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت براء بن معرور اور حضرت ابو الہیثم بن تیہان شامل تھے۔ حضرت رافع بن مالک کو بھی بیعت عقبۂ ثانیہ یا بیعت الحرب میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہوا۔

نقیبوں کا انتخاب

بیعت مکمل ہو چکی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بارہ سربراہ منتخب کر لیے جائیں جو اپنی اپنی قوم کے نقیب ہوں اور اس بیعت کی دفعات کی تنفیذ کے لیے اپنی قوم کی طرف سے ذمہ دار اور مکلف ہوں۔ خزرج سے نو اور اوس سے تین نقیب منتخب کیے گئے (احمد، رقم ۱۴۴۵۶۔ المعجم الاوسط، رقم ۴۵۳۸)۔ آپ نے حضرت رافع بن مالک کو خزرج کی شاخ بنو زریق کا نقیب مقرر فرمایا۔ حضرت اسعد بن زرارہ، حضرت براء بن معرور، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت منذر بن عمرو، حضرت سعد بن ربیع، حضرت عبد اللہ بن رواحہ، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت اسید بن حضیر، حضرت سعد بن خیثمہ اور حضرت رفاعہ بن عبد المنذر اپنے اپنے قبیلوں کے نقیب مقرر ہوئے۔

مواخات

ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس بن مالک کے گھر مہاجرین وانصار کے مابین رشتۂ مواخات قائم کیا تو حضرت سعید بن زید کو حضرت رافع بن مالک کا مہاجر بھائی قرار فرمایا۔

سریۂ حمزہ بن عبدالمطلب (سریۂ سیف البحر)

سریۂ حمزہ بن عبدالمطلب یا سریۂ سیف البحر تاریخ اسلام کا پہلا سریہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان یکم ہجری (۶۲۳ء) کو حضرت حمزہ کی قیادت میں تیس مہاجرین پر مشتمل دستہ ابوجہل کی سربراہی میں شام سے آنے والے قریش کے تین سو رکنی قافلے کو روکنے کے لیے روانہ کیا۔ بحراحمر کے ساحل (عربی میں سیف) پر ینبع اور مروہ کے درمیان عیص کے مقام پر ان کی مڈبھیڑ ہوئی، لیکن قبیلۂ جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو جہنی کی ثالثی سے، جو مسلمانوں اور قریش کا حلیف تھا، جنگ ٹل گئی۔ قریش کا قافلہ مکہ لوٹ گیا اور مسلمان مدینہ واپس آ گئے۔

واقدی کہتے ہیں: یہ سریہ پندرہ مہاجرین اور پندرہ انصار پر مشتمل تھا۔ مہاجرین میں انھوں نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، ان کے آزاد کردہ حضرت سالم، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت زید بن حارثہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ حضرت انسہ اور انصار میں سے حضرت رافع بن مالک، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت اوس بن خولی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام، حضرت قطبہ بن عامر اور دیگر صحابہ کے نام شمار کیے۔ پھر خود ہی کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر سے پہلے کسی مہم میں انصار کو شامل نہ کیا، کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ وہ شہر مدینہ کے اندر رہ کر آپ کی نصرت کریں گے (کتاب المغازی، واقدی ۹-۱۰)۔ ابن سعد نے اسی کو ثابت شدہ قرار دیا (الطبقات الکبریٰ ۱/۳۴۹)

جنگ بدر

حضرت رافع بن مالک کی اسلامی زندگی میں بدر واحد دو غزوات پیش آئے۔ غزوۂ بدر میں ان کی شرکت مشکوک ہے۔ ابن اسحٰق سے مروی دو روایتوں میں سے ایک میں انھیں بدری بتایا گیا ہے (مستدرک حاکم، رقم ۵۰۲۲) اور دوسری میں ان کو اصحاب بدر میں شمار نہیں کیا گیا (الاستیعاب ۴۸۴۔ اسد الغابہ ۱۵۸)۔ زہری کا کہنا ہے: وہ معرکۂ فرقان میں شریک تھے (الاستیعاب ۴۸۴)۔ مزی حضرت رفاعہ بن رافع کا ترجمہ بیان کرتے

ہوئے کہتے ہیں: وہ اور ان کے والد غزوۂ بدر میں موجود تھے (تہذیب الکمال، رقم ۱۹۱۵)۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے حضرت رافع بن مالک کا نام ''اصحاب بدر'' میں شامل نہیں کیا۔ ابن حجر کہتے ہیں: صحیح بات ہے کہ وہ جنگ بدر میں شریک نہ تھے (تہذیب التہذیب، رقم ۱۹۳۱)۔

حضرت رافع کے بیٹوں حضرت رفاعہ بن رافع اور حضرت خلاد بن رافع کا جنگ بدر میں حصہ لینا ثابت ہے، وہ بیعت عقبہ میں شریک نہ تھے۔

جنگ احد

جنگ احد ۷/ شوال ۳ھ (۲۳/ مارچ ۶۲۵ء) میں مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان احد پہاڑ کے دامن میں لڑی گئی۔ مشرک لشکر کی سالاری ابوسفیان کے پاس تھی، جب کہ اہل ایمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جمع تھے۔

پس منظر

غزوۂ بدر میں ہزیمت اٹھانے کے بعد مشرکین مکہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ جنگ کے شعلے بھڑکانے میں قریش کے سردار ابوسفیان، اس کی بیوی ہندہ اور ایک یہودی کعب الاشرف نے اہم کردار ادا کیا۔ جنگ کے لیے مال و دولت اکٹھا کیا گیا، تین ہزار سپاہی، دو سو گھوڑے اور تین سو اونٹ مہیا کیے گئے۔ مکہ میں موجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب عباس نے آپ کو خبر کر دی۔ آپ نے انصار و مہاجرین سے مشورہ کیا کہ شہر میں رہ کر دفاع کیا جائے یا باہر جا کر جنگ لڑی جائے۔ فیصلہ آپ کی ترجیح کے خلاف مدینہ سے باہر لڑنے پر ہوا۔ چنانچہ ۶/ شوال کو نماز جمعہ کے بعد آپ ایک ہزار کی فوج لے کر مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ اشواط کے مقام پر منافق عبداللہ بن ابی اپنے تین سو سواروں کے ساتھ واپس ہو گیا اور بہانہ یہ بنایا کہ شہر کے اندر رہ کر لڑنے کا اس کا مشورہ نہیں مانا گیا۔ دونوں فوجیں احد کے دامن میں آمنے سامنے آئیں تو احد کا پہاڑ مسلمانوں کی پشت پر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے درے پر حضرت عبداللہ بن جبیر کی قیادت میں پچاس تیر اندازوں کا دستہ مقرر کیا تاکہ دشمن اس راستے سے میدان جنگ میں نہ آ سکے۔

جنگ کا آغاز

جنگ کے آغاز میں مکہ کے نو مشرک آگے بڑھے جو سب قتل ہوئے۔ پھر ان کی فوج نے بھرپور حملہ کر دیا۔

زبردست جنگ میں مسلمانوں نے کئی دشمنوں کو قتل کیا۔ وہ فرار ہونے لگے تو مسلمان سمجھے کہ وہ جنگ جیت گئے ہیں۔ اس موقع پر درۂ عینین پر متعین اصحاب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت فراموش کر دی کہ درہ کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا۔ ان کی اکثریت نے میدان میں اتر کر مال غنیمت اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ صرف دس افراد درہ پر رہ گئے۔ قریش کی فوج میں شامل خالد بن ولید نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کوہ احد کا چکر لگا کر درہ پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں پر یک دم پیچھے سے ہلہ بول دیا۔ اسی اثنا میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیے گئے ہیں۔ یہ سن کر اکثر اصحاب نے ہمت ہار دی اور میدان جنگ سے فرار ہو گئے، کچھ ارد گرد کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے، کچھ نے سوچا کہ آپ کے بعد زندگی کسی کام کی نہیں، کچھ آپ کے ساتھ رہ گئے اور آپ کی بھرپور حفاظت کی۔

کچھ وقفے کے بعد صحابہ میدان میں واپس آنا شروع ہو گئے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید نہیں ہوئے، مشرکین نے مکہ کی طرف واپسی اختیار کر لی۔

نتائج

اس جنگ میں ستر مسلمان، جن میں حضرت رافع بن مالک شامل تھے، شہید ہوئے، جب کہ ستائیس مشرکین ہلاک ہوئے۔ جنگ کے نتیجہ کو کسی کی فتح یا شکست نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ دونوں طرف شدید نقصان ہوا اور کبھی مسلمان غالب آئے اور کبھی مشرکین، لیکن آخر میں مشرکین کا لشکر لڑائی ترک کر کے مکہ واپس چلا گیا۔ یہ واضح ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات فراموش کرنے یا عسکری نظم وضبط ترک کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اگر درۂ عینین پر تعینات لوگ درہ نہ چھوڑتے تو مسلمان فتح یاب ہو چکے تھے۔

شہادت

حضرت رافع بن مالک نے شوال ۳ھ (۶۲۶ء) میں غزوۂ احد میں شہادت پائی۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کی شہادت کیسے ہوئی۔ واقدی نے شہداے احد کے عنوان کے تحت دس مہاجرین اور اٹھاون انصار کے نام گنوائے اور ان کے قاتلوں کے نام لکھے، لیکن بنو زریق کے ایک ہی شہید حضرت ذکوان بن عبد قیس کا ذکر کیا۔ بلاذری نے اوس کے اکیس اور خزرج کے سینتیس شہداے احد کی تفصیل بیان کی، لیکن حضرت رافع بن مالک کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

شہداے احد کا جنازہ

حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ شہداے احد کو خون آلود کپڑوں میں دفن کر دیا جائے۔ آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی، نہ انھیں غسل دیا گیا (بخاری، رقم ۴۰۷۹)۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنی کی روایت میں غزوہ کے بعد نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکلے اور غزوۂ احد کے شہیدوں کی اسی طرح نماز جنازہ پڑھی، جس طرح آپ ہر میت کی پڑھتے تھے (بخاری، رقم ۳۵۹۶۔ مسلم، رقم ۶۰۴۱۔ ابوداؤد، رقم ۳۲۲۳۔ نسائی، رقم ۱۹۵۶۔ احمد، رقم ۱۷۴۰۲)۔ ابن حجر کہتے ہیں: یہ جنگ احد کے آٹھ سال بعد آپ کی حیات مبارکہ کے آخری ایام کا واقعہ ہے (فتح الباری، شرح حدیث ۶۴۲۶)۔ احناف شہید کی نماز جنازہ کو واجب سمجھتے ہیں۔ انور شاہ کشمیری نے اس باب میں سکوت کیا اور کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا (فیض الباری، شرح حدیث ۱۳۴۳)۔

تدفین

احد کے کچھ شہدا کی میتیں مدینہ منتقل کی جا رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں واپس لا کر ان کی جاے شہادت پر دفن کرنے کی منادی کرائی (ابوداؤد، رقم ۳۱۶۵۔ ترمذی، رقم ۱۷۱۷۔ نسائی، رقم ۲۰۰۶۔ ابن ماجہ، رقم ۱۵۱۶۔ احمد، رقم ۱۵۲۸۱)۔ لگتا ہے کہ حضرت رافع کے لواحقین تک آپ کے منادی کی آواز نہیں پہنچی۔ عمر بن شبہ نمیری کہتے ہیں: حضرت رافع کو ان کے قبیلے بنوزریق میں آل نوفل بن مساحق کے محلے میں دفن کیا گیا (تاریخ المدینۃ المنورہ، ابن شبہ ۱۳۰)۔

عائلی زندگی

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی بہن حضرت ام مالک بنت ابی حضرت رافع بن مالک کی زوجیت میں تھیں۔ وہ سچی مومنہ تھیں۔ انھوں نے اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کر رکھی تھی۔ ان کے بطن سے حضرت خلاد بن رافع اور حضرت رفاعہ بن رافع نے جنم لیا۔ حضرت رفاعہ بیعت عقبہ، غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب اور صلح حدیبیہ میں شریک رہے۔ وہ خلیفۂ سوم حضرت عثمان کے ناقدین میں شامل تھے۔ انھوں نے جنگ جمل و صفین میں حضرت علی کا ساتھ دیا۔ حضرت خلاد بن رافع نے بدر و احد کی جنگوں میں حصہ لیا۔

روایت حدیث

حضرت رافع بن مالک اپنے بیٹے حضرت رفاعہ سے کہا کرتے تھے: مجھے کوئی خوشی نہ ہوتی اگر میں بیعت عقبہ چھوڑ کر جنگ بدر میں شریک ہوتا (بخاری، رقم ۳۹۹۳)۔

ابن حجر کہتے ہیں: یہ بات حضرت رافع نے اپنے اجتہاد سے کہی۔ ایسے لگتا ہے، انھیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل بدر کی فضیلت سننے کا موقع نہ ملا۔ بلاشبہ بیعت عقبۂ ثانیہ سے نصرت اسلام کی ابتدا ہوئی اور وہ ہجرت مدینہ کا سبب بنی، جس کے بعد مسلمانوں میں غزوۂ بدر اور تمام معرکوں میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہوئی، تاہم 'الفضل بيد الله يؤتيه من يشاء' (فتح الباری، شرح حدیث ۳۹۹۳) یہ بات اس سے پہلی روایت سے عیاں ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سوال کیا: آپ اہل بدر کو اپنے ہاں کیسا سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں۔ حضرت جبریل نے جواب دیا: اسی طرح وہ فرشتے بھی سب سے زیادہ صاحب فضیلت ہیں جنھوں نے بدر میں حصہ لیا (بخاری، رقم ۳۹۹۲۔ ابن ماجہ، رقم ۱۶۰۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۱۳۱۔ معرفۃ الصحابہ، ابونعیم، رقم ۲۶۴۱)۔

حضرت رفاعہ بن رافع فرماتے ہیں: ایک بار میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی۔ چھینک آنے پر میں نے یہ کلمات ادا کیے: 'الحمد لله حمدًا كثيرًا طيبًا مباركًا فيه كما يحب ربنا ويرضى' (شکر ہے اللہ کا بے شمار شکر، پاکیزہ، برکت دیا ہوا جیسے ہمارا رب پسند کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے)۔ نماز پڑھانے کے بعد آپ مڑے اور دریافت فرمایا: نماز میں یہ کلمات ادا کرنے والا کون تھا؟ میں بولا: میں تھا۔ آپ نے کلمات دوبارہ سنے، پھر فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تیس سے زیادہ فرشتے ان کلمات کو اوپر لے جانے کے لیے لپکے۔

یہ روایت حضرت رفاعہ بن رافع سے اور ان کے بارے میں مروی ہے، جیسا کہ سنن ابوداؤد، رقم ۷۷۳، جامع ترمذی، رقم ۴۰۴، نسائی، رقم ۹۳۲ اور معرفۃ الصحابۃ (ابونعیم اصفہانی)، رقم ۲۷۱۳ سے واضح ہے، لیکن حاکم نے اسے حضرت رافع بن مالک سے منسوب کر دیا ہے (مستدرک، رقم ۵۰۲۳)۔

مطالعۂ مزید: کتاب المغازی (واقدی۔ Oxford University ۱۹۶۶ء)، السیرۃ النبویۃ (ابن اسحٰق۔ دار الکتب العلمیۃ ۲۰۰۴ء)، السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام۔ دار الخیر ۱۹۹۵ء)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد۔ دار الفکر ۱۹۹۴ء)، انساب الاشراف (بلاذری۔ دار الفکر ۱۹۹۶ء)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر۔ دار الجیل

۱۹۹۲ء)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی۔ دار الفکر ۱۹۹۵ء)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر۔ دار احیاء التراث العربی ۱۳۷۷ھ)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر۔ دار ابن کثیر ۲۰۰۷ء)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر۔ دار المعرفۃ ۲۰۰۴ء)، Wikipedia۔

ڈاکٹر محمد سعد سلیم

علامات قیامت: بائیبل اور قرآن کی روشنی میں

(۱)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

تعارف

یہ مضمون بائیبل اور قرآن کی پیشین گوئیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے قیامت کی نشانیوں کو سمجھنے کے لیے ایک منفرد فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ احادیث میں بیان کردہ قیامت کی نشانیاں جغرافیائی، سماجی اور تاریخی تغیرات کی پیچیدہ عکاسی کرتی ہیں، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا کی صورت میں دکھائی گئیں۔ اس مضمون میں ان نشانیوں کی تعبیر الہامی کتب کی روشنی میں کی گئی ہے۔

یہ علامتی انداز نہ صرف ان اہم پیغامات کو موثر طریقے سے بیان کرتا ہے، بلکہ انھیں نسل در نسل منتقل کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ساتھ ہی، یہ مستقبل کے مخصوص حالات کو ایک حد تک پوشیدہ رکھتا ہے۔ جب ان پیشین گوئیوں کو تاریخی تناظر میں غیر جانب دار اور وسیع ذہن کے ساتھ پرکھا جائے تو یہ متعدد تاریخی حقائق سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کا مقصد ماضی کے انسانی اعمال کی اخلاقی توثیق یا تنقید نہیں، بلکہ اللہ کے کامل علم، قدرت اور تاریخ میں اس کی حاکمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

اس مضمون کے تین بنیادی مقاصد ہیں: پہلا مقصد یہ ہے کہ خدا کو کائنات کے خالق اور پروردگار کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی دعوت دی جائے — ایسا رب جو نہ صرف مومنین، بلکہ غیر مومنین پر بھی حاکم ہے

—— تاکہ الٰہی حاکمیت کی عالم گیریت کو نمایاں کیا جا سکے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ پیشین گوئیوں کی روشنی میں عصر حاضر کی درست شناخت کی جائے تاکہ مسلمان اپنی فکری اور عملی سمت کا تعین کسی غلط مفروضے کی بنیاد پر نہ کریں۔ تیسرا اور نہایت اہم مقصد یہ ہے کہ واضح کیا جائے کہ یہ پیشین گوئیاں قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کردہ موجودہ دینی فرائض کے علاوہ کسی نئی مذہبی ذمہ داری کا تقاضا نہیں کرتیں۔ اس وضاحت کے نتیجے میں اہل ایمان غیر ضروری فکری و عملی بوجھ سے آزاد ہو کر اپنی اصل دینی ذمہ داریوں پر یک سوئی سے توجہ دے سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر حدیث میں دجال کے فتنے کے دوران میں پہاڑوں میں پناہ لینے کا ذکر قرآن کے اس اصول سے ہم آہنگ ہے جو مذہبی جبر کے وقت ہجرت کی تلقین کرتا ہے۔ یہ الٰہی رہنمائی کا تسلسل ہے، اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں احکام دینے کے بجائے مومنین کو تاریخی اور عالمی واقعات میں خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرنے اور اس کی تصدیق کرنے کے قابل بناتی ہیں۔

مضمون کا دعویٰ ہے کہ قیامت کی بہت سی نشانیاں بڑے عالمی واقعات کی نمایندگی کرتی ہیں، جن میں سے کئی شاید پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ مضمون کے تمام حدیث کے حوالہ جات صرف صحیح مسلم اور صحیح بخاری پر مبنی ہیں تاکہ اس کی درستگی اور اعتبار کو یقینی بنایا جا سکے۔

مستقبل کی پیشین گوئیاں

اللہ نے اپنی مخلوق کو سیدھے راستے پر گام زن کرنے کے لیے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا، جنھیں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے الٰہی وحی عطا کی گئی۔ ان وحیوں میں بعض اوقات مستقبل کے واقعات کی جھلکیاں شامل ہوتیں، جو اللہ کے علم کامل کی واضح گواہی تھیں۔ کچھ مواقع پر یہ واقعات واضح الفاظ میں بیان کیے گئے، جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ روم میں رومیوں کی ساسانیوں پر فتح کا ذکر، جب کہ دیگر مواقع پر یہ وحی رؤیا کی صورت میں پیش کی جاتی۔ مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خواب میں آسمانی اجسام کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا، جو ان کی آزمایشوں کے بعد ان کے خاندان کی طرف سے عزت و تکریم کی علامت تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک رؤیا میں اپنے بیٹے کی قربانی کا منظر دکھایا گیا، جو ان کے اور ان کے بیٹے کے لیے ایک عظیم آزمایش تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے نے اسے اطاعت کی آزمایش سمجھتے ہوئے عظمت کا رویہ اپنایا اور اس پر من و عن عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم اللہ کی مداخلت نے قربانی کو روک دیا،

کیونکہ اس خواب کی تعبیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان، یعنی اللہ کے گھر کی خدمت کے لیے نذر کر دینا تھی۔[1] اس آزمایش میں اللہ کے حکم کے سامنے مکمل اطاعت اور ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادگی نے ان کے اس عمل کو بندگی، وفاداری اور خلوص کی عظیم مثال بنا دیا۔

تاہم، رؤیاؤں کی علامتی نوعیت انھیں اکثر غلط فہمی کا شکار بنا دیتی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال کتاب مکاشفہ میں ملتی ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ یہ متن مختلف علامتی رؤیا پر مشتمل ہے، جن میں آفات، تاریخی واقعات اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا ذکر شامل ہے۔ کتاب مکاشفہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''ذبح شدہ برہ''[2] کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو انبیا کی معصومیت، قربانی اور اللہ کے لیے مکمل وفاداری کی علامت ہے۔ یہ تمثیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب، جسے اوپر بیان کیا گیا ہے، سے مشابہت رکھتی ہے، جہاں قربانی کا تصور اللہ کی رضا اور حکم کے سامنے مکمل تسلیم و رضا کی نشان دہی کرتا ہے۔ تاہم عیسائیوں نے ''ذبح شدہ برہ'' کی اس علامت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت کا حوالہ سمجھ لیا۔ یہ غلط تشریح اس بات کی یاددہانی ہے کہ علامتی روایات کو سمجھنے میں پہلے سے اپنائے گئے خیالات، جو محکم علمی طریقے سے حاصل نہ کیے گئے ہوں، غلط نتائج کی طرف لے جاتے ہیں۔

پیشین گوئیوں کو سمجھنے کے بنیادی اصول

اس مضمون میں حدیث میں بیان کردہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیا میں دکھائی گئی پیشین گوئیوں کی تفہیم کے لیے درج ذیل اصولوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

پہلا اصول: انسانی و حیوانی علامات کی تعبیر

احادیث میں پیشین گوئیوں کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس طرح سابقہ الہامی کتابوں، جیسے کتاب دانیال اور مکاشفہ میں بھی مستقبل کے واقعات کو خواب اور رؤیا کی شکل میں بیان کیا گیا۔ ان متون میں جانوروں اور انسانوں کی علامات مختلف طاقتوں، جیسے سلطنتوں، ملکوں اور تنظیموں کی نمایندگی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر

---

1. Quran Exegesis 37:102-113

https://www.javedahmedghamidi.org/#!/quran?chapter=37&paragraph=13&type=Ghamidi#fn_60

2. Revelation 5:5-6: https://www.bible.com/bible/111/REV.5.5-6.NIV

کتاب دانیال میں بابل کی سلطنت کے آخری دور میں اس سلطنت کو ایک انسان اور اس کے بعد آنے والی یونانی سلطنت کو ایک جانور کی صورت میں حضرت دانیال علیہ السلام کے خواب میں دکھایا گیا،[3] جو اسی علامتی طرز بیان کا حصہ ہے جس کے تحت احادیث میں ''دجال'' کو ایک انسان اور ''زمین کا جانور'' کو ایک جانور کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا اصول: مقامات اور گروہوں کے علامتی معانی

احادیث میں مذکور جغرافیائی مقامات اور انسانی گروہوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے سیاسی اور تہذیبی سیاق و سباق میں سمجھنا ضروری ہے، بالکل اسی طرح جیسے قرآن کی تفہیم اُس وقت کی عربی زبان اور اس کے لسانی پس منظر کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ علامتی انداز بیان احادیث کو ایسی معنویت اور تسلسل عطا کرتا ہے جو وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور جغرافیائی تقسیم کے باوجود بھی برقرار رہتا ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قسطنطنیہ بازنطینی عیسائیوں کا دارالحکومت تھا، اور اس کی فتح کے وقت بھی یہی حیثیت قائم تھی، اس لیے حدیث میں اسے اسی اصل نام سے بیان کیا گیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ''شام'' بازنطینی سلطنت کے زیر اقتدار تھا، اس لیے ابتدائی دور سے متعلق پیشین گوئیوں میں ''شام'' سے مراد حقیقی جغرافیائی شام ہے۔ البتہ بعد کی پیشین گوئیوں میں ''شام'' ایک علامتی مفہوم اختیار کر لیتا ہے، جو عیسائی طاقتوں کے زیر اثر علاقوں کی نمایندگی کرتا ہے۔

اسی سیاق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے کچھ عرصے بعد خلافت کا مرکز عرب سے باہر منتقل ہو گیا، لہٰذا مدینہ کا ذکر بعد کے دور سے متعلق احادیث میں صرف ایک شہر نہیں، بلکہ پوری مسلم امت کی علامت کے طور پر کیا جاتا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ مسلمانوں کی ریاست کا مرکز تھا۔ اسی طرح دیگر مقامات جیسے دمشق، لد اور یمن کو بھی اُن کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں سمجھنا ضروری ہے تاکہ احادیث کی تعبیر درست ہو سکے۔

اسی اصول کے تحت احادیث میں ذکر کردہ انسانی گروہوں کو بھی اُن کے وقت کی تاریخی شناخت کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر بازنطینی رومیوں کی عیسائیت ان کی شناخت کا ایک بنیادی جزو تھی، اور اگرچہ

3. Daniel 7:17–27: https://www.bible.com/bible/111/dan.7.17-27.NIV

ان کی سلطنت ۱۴۵۳ء میں ختم ہو گئی، احادیث میں بعد کے عیسائی گروہوں کو بھی "رومیوں" سے ہی پکارا گیا ہے۔[۴] اسی طرح، بنی اسحٰق اور اصفہان کے یہودیوں جیسے دیگر گروہوں کا ذکر بھی اُن کے مخصوص تاریخی سیاق میں ہی سمجھا جانا چاہیے تاکہ ان سے متعلق احادیث کی تعبیر درست ہو سکے۔

تیسرا اصول: تفصیلات کا الٰہی حکمت کے تحت مخفی ہونا

احادیث میں بیان کردہ پیشین گوئیوں میں بعض علامات اور تفصیلات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت پوشیدہ رکھا ہے تاکہ ان کی مکمل تفہیم صرف ظہور کے بعد ہی ممکن ہو۔ یہ علامات اکثر علامتی زبان میں بیان کی گئی ہیں، جو کسی بڑے واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہیں، مگر اس کی جزئیات کو ظاہر نہیں کرتیں۔ مثال کے طور پر یاجوج وماجوج کی گردنوں پر کیڑوں سے اچانک موت دراصل کسی بڑے عامل کی علامت ہے، جسے تفصیل سے بیان کرنے کے بجائے علامتی اسلوب میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح، مدینہ میں تین جھٹکوں کے نتیجے میں منافقین اور کافروں کا دجال کی طرف لپکنا اُن آزمایشوں پر پردہ ڈالتا ہے جو جھٹکوں کی صورت میں ظاہر کی گئیں۔ ایسی پیشین گوئیوں کی صحیح تعبیر تاریخی سیاق میں اُن کے وقوع کے بعد ہی سامنے آتی ہے، جب یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ علامات کن حقیقی واقعات کی نمایندگی کر رہی تھیں۔

قیامت کی دس بڑی نشانیاں

آیندہ حصوں میں قیامت سے پہلے پیش آنے والے اہم واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بیان ہوا ہے۔ یہ واقعات قیامت کی دس بڑی نشانیوں پر مبنی ہیں،[۵] جن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رؤیا میں دکھایا گیا۔[۶] مثال کے طور پر دجال کو معراج کے واقعے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا،[۷] جو ایک رؤیا تھی۔[۸]

---

4. Sahih Muslim 2898a: https://sunnah.com/muslim:2898a

5. Sahih Muslim 2901a: https://sunnah.com/muslim:2901

۶۔ نزول مسیح، سید منظور الحسن، نومبر ۲۰۲۳ء، غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکا، ۱۸۵-۲۱۷۔

7. Bukhari 3239: https://sunnah.com/bukhari:3239

8. Bukhari 7517: https://sunnah.com/bukhari:7517

زمین کا جانور (دابة الأرض)

قیامت کی نشانیوں میں ریاستوں، سلطنتوں، بادشاہتوں اور تنظیموں کو اکثر جان دار مخلوق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جو طاقت ور قوتوں کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے ایک علامتی انداز ہے۔ یہ علامتی اظہار مختلف مذہبی متون، جیسے بائیبل، قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں نمایاں ہے۔ زمین کا جانور (دابة الأرض) ان روایات میں ایک اہم استعارہ کے طور پر سامنے آتا ہے، جو جابر، وسیع اور اکثر ظالم ریاستوں کی نمایندگی کرتا ہے۔

پرانے عہد نامے سے مثالیں

پرانے عہد نامے میں خاص طور پر صحیفۂ دانیال میں، حضرت دانیال علیہ السلام کے خوابوں میں جانوروں کی علامات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ جانور طاقت ور اور ظالم سلطنتوں کی تمثیل کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ بائیبل کے موجودہ قدیم ترین نسخے یونانی زبان میں تحریر کیے گئے، جہاں ''تھریون'' کا مطلب ''جانور'' تھا، جو عربی لفظ 'دابة' سے مماثلت رکھتا ہے اور دونوں زبانوں میں ایک جیسے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے خوابوں میں یہ جانور بڑی سلطنتوں کی نمایندگی کرتے ہیں، جو اپنی طاقت، ظلم اور وسعت کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ کچھ جانوروں کو کئی سروں کے ساتھ دکھایا گیا، جو ایک سلطنت کے مختلف خاندانوں، گروہوں یا دھڑوں کی نمایندگی کرتے ہیں، جب کہ ان کے سینگ بادشاہوں، حکمرانوں یا بااثر رہنماؤں کی علامت ہیں۔

چار جانور — چار قدیم عالمی سلطنتیں

چار جانوروں کا ذکر صحیفۂ دانیال[9] میں ملتا ہے۔ یہ جانور ایک کے بعد ایک آنے والی عالمی سلطنتوں کی نمایندگی کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت دانیال علیہ السلام کو وضاحت کی گئی:[10]

پہلا جانور — بابل کی سلطنت: پہلا جانور ایک شیر کے مانند ہے، جس کے عقاب کے پر ہیں، جو بعد میں ایک انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسے انسانی دماغ دیا جاتا ہے۔ یہ بابل کی سلطنت (۶۰۵-۵۳۹ قبل مسیح)

9. Daniel 7:1–28: https://www.bible.com/bible/111/DAN.7.NIV

10. Daniel 7:17–27: https://www.bible.com/bible/111/dan.7.17-27.NIV

کی نمایندگی کرتا ہے۔ یہ سلطنت اپنی طاقت، غلبے اور تیز رفتاری کے لیے مشہور تھی۔

دوسرا جانور—ہخامنشی سلطنت: دوسرا جانور ریچھ کے مانند ہے، جو مادی-فارس کی ہخامنشی سلطنت (۳۳۱-۵۳۹ قبل مسیح) کی نمایندگی کرتا ہے۔ یہ سلطنت اپنی بے پناہ طاقت اور فتح کے لیے مشہور تھی اور اپنی درندگی کے سبب خوف پیدا کرتی تھی۔

تیسرا جانور—یونانی سلطنت: تیسرا جانور ایک تیندوا کے مانند ہے، جس کے چار پر اور چار سر ہیں۔ یہ یونانی سلطنت (۱۴۶-۳۳۱ قبل مسیح) کی نمایندگی کرتا ہے، جو سکندر اعظم کی قیادت میں عالمی سطح پر چھا گئی۔ اس کے چار سر سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت کے چار حصوں میں تقسیم ہو جانے کی علامت ہیں۔

چوتھا جانور—رومی سلطنت: چوتھا جانور لوہے کے دانتوں اور دس سینگوں کے ساتھ نہایت خوف ناک اور دہشت انگیز ہے۔ یہ رومی سلطنت (۱۴۶ قبل مسیح) کی نمایندگی کرتا ہے، جو بے مثال طاقت اور غلبے کی علامت تھی۔ اس کے لوہے کے دانت اس کی بے رحمی اور طاقت ور تسلط کو ظاہر کرتے ہیں۔

مینڈھا اور بکرا—ہخامنشی اور یونانی سلطنت

صحیفۂ دانیال میں بیان کردہ ایک اور رؤیا میں مینڈھے اور بکرے کا ذکر ملتا ہے۔[11] حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت دانیال علیہ السلام کو اس رؤیا کی وضاحت کی۔[12] مینڈھا دو سینگوں کے ساتھ ہخامنشی سلطنت کی نمایندگی کرتا ہے، اور یہ سینگ ہخامنشی سلطنت میں مادی اور فارس کی مشترکہ طاقت کی علامت ہیں۔ بکرا یونانی سلطنت کی نمایندگی کرتا ہے، جو مینڈھے کو شدت کے ساتھ ٹکر مار کر زمین پر گرا دیتا ہے اور اسے شکست دیتا ہے۔ بکرے کی آنکھوں کے درمیان ایک نمایاں سینگ سکندر اعظم کی طاقت اور قیادت کو ظاہر کرتا ہے۔ بکرے کے سینگ کا ٹوٹنا، اور اس کی جگہ چار چھوٹے سینگوں کا نمودار ہونا، سکندر اعظم کی وفات کے بعد اس کی عظیم سلطنت کے اس کے چار جرنیلوں میں تقسیم ہو جانے کی علامت ہے۔ یہ رؤیا تاریخ کے دھارے میں بڑی سلطنتوں کی طاقت، ان کا عروج اور ان کا زوال بیان کرتی ہے۔

نئے عہد نامہ سے مثالیں

جانوروں کے استعارے کا تسلسل نئے عہد نامے میں بھی جاری رہتا ہے، خاص طور پر کتاب مکاشفہ میں،

11. Daniel 8:1–27: https://www.bible.com/bible/111/DAN.8.1-27.NIV

12. Daniel 8:19–25: https://www.bible.com/bible/111/DAN.8.19-25.NIV

جہاں تین علامتی جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سمندر کا جانور—رومی سلطنت

کتاب مکاشفہ میں بیان کیا گیا یہ جانور رومی سلطنت کی نمایندگی کرتا ہے،[13] جو اپنی طاقت ور بحری قوت اور سمندر کے ذریعے سے پھیلنے والے وسیع اثر و رسوخ کے لیے مشہور تھی۔ اس کا سمندر سے ابھرنا روم کی بحری طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے سات سر سات شاہی ادوار کی نمایندگی کرتے ہیں، اور ہر سر پر تحریر گستاخانہ الفاظ اس کے خدا کے خلاف سرکشی اور تکبر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس جانور کو بیالیس مہینوں تک غرور اور کفر کے کلمات کہنے کی طاقت دی گئی۔[14] یہ بیالیس مہینے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے بعد ۶۶ء سے ۷۰ء میں رومیوں اور یہودیوں کی جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس کا انجام ۷۰ء میں رومیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے معبد کی بے حرمتی اور مکمل تباہی پر ہوا۔

زمین کا جانور—کلیسا

کتاب مکاشفہ میں ذکر کردہ زمین کا جانور زمین پر مبنی ایک اتھارٹی کی علامت ہے، جو جھوٹے پیغامات کے ذریعے سے عوام کو دھوکا دیتی ہے۔ اسے ''جھوٹا نبی'' کہا گیا ہے، جو شیطانی اثر و رسوخ کے تحت کام کرتے ہوئے جھوٹے نظریات پھیلانے کی نمایندگی کرتا ہے۔ یہ جانور اپنی طاقت سمندر کے جانور کی اتھارٹی سے حاصل کرتا ہے اور اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب سمندر کے جانور کے ایک سر پر لگا مہلک زخم بھر چکا ہوتا ہے۔[15] یہ زخم رومی سلطنت کے تیسری صدی کے بحران کی علامت ہے، جس کے بعد کلیسا ۳۲۵ عیسوی میں منعقد ہونے والی کونسل آف نائسیا کے نتیجے میں ایک باقاعدہ ادارے کے طور پر سامنے آیا۔ کلیسا نے رومی سلطنت کے اختیار کا استعمال کرتے ہوئے ان مخالف عیسائیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانا شروع کیا جو نائسین عقائد کے مخالف تھے، جیسے کہ آریئن، ڈوناٹسٹ، مارسیونائٹس اور مونٹینسٹ۔ ''زمین کے جانور'' کی علامت میں اس کے دو سینگ برہ کی طرح نظر آتے ہیں، جو ظاہر میں نرمی، تقدس اور معصومیت کا تاثر دیتے ہیں، لیکن اس کی زبان اژدھے کے مانند ہے، جو فریب، دھمکی اور گم راہی کی نمایندہ ہے۔ یہ دو سینگ کلیسا کے دو بڑے دھڑوں —— قسطنطنیہ

13. Revelation 13:1–10: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.1-10.NIV
14. Revelation 13:5–10: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.5-10.NIV
15. Revelation 13:11–12: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.11-12.NIV

(مشرق) اور روم (مغرب) ــــ کی مذہبی قوت کو ظاہر کرتے ہیں۔[16]

کتاب مکاشفہ میں سمندر اور زمین کے جانور کی شکست[17] رومیوں کی وہ شکست ظاہر کرتی ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں ہوئی، جس نے نہ صرف روم اور کلیسا کی طاقت و اثر و رسوخ کو کم زور کیا، بلکہ ان کے طریقۂ کار، فلسفہ اور نظریات پر بھی گہرا اثر ڈالا۔

سرخ رنگ کا جانور—ایرانی سلطنت

کتاب مکاشفہ میں ذکر کردہ یہ جانور فارسی سلطنت کی نمایندگی کرتا ہے۔[18] اس کے سات سر[19] سات مختلف خاندانوں کی علامت ہیں۔ چھٹا سر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کے پارتھیوں سے مطابقت رکھتا ہے، جب کہ ساتواں سر ساسانی سلطنت کی نمایندگی کرتا ہے۔[20] اس کے دس سینگ اُن دس ساسانی بادشاہوں کی علامت ہیں[21] جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ساسانیوں کے درمیان ہونے والی جنگوں سے قبل، کتاب مکاشفہ کے مطابق 'ایک گھڑی'، یعنی نہایت مختصر مدت کے لیے اقتدار میں آئے۔[22]

---

16. Revelation 13:11: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.11
17. Revelation 19:19-21: https://www.bible.com/bible/111/REV.19.19-21
18. Revelation 17:3–14: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.3-14.NIV
19. Revelation 17:7: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.7.NIV
20. Revelation 17:10: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.10.NIV
21. Revelation 17:12–14: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.12-14

۲۲۔ ۱۔ قباد دوم (شیرویہ) (۶۲۸)

۲۔ اردشیر سوم (۶۲۸-۶۳۰)

۳۔ شہر وراز (۶۳۰)

۴۔ بوران (۶۳۰-۶۳۲)

۵۔ خسرو سوم (۶۳۰)

۶۔ شابور بن شہر وراز (۶۳۰)

۷۔ آزرمی دخت (۶۳۰-۶۳۱)

۸۔ ہرمیز ششم (۶۳۰-۶۳۲)

قرآن میں جانور کا ذکر — قریش کے لیے تنبیہ

قرآن پاک کی سورۂ نمل[23] میں زمین سے نکلنے والے جانور (دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ) کا ذکر ملتا ہے، جو منکرین حق سے گفتگو کرے گا۔ یہ آیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش کے لوگوں کے کفر اور انکار کے جواب میں بیان کی گئی ہے۔

قرآن کی اس تنبیہ میں 'دابہ' کے ''بولنے'' کا موازنہ اگر نئے عہد نامے میں مذکور ''سمندر کے جانور'' سے کیا جائے — جو بیالیس مہینے تک گستاخانہ اور متکبرانہ گفتگو کرتا ہے[24] — تو دونوں واقعات میں ایک گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ نئے عہد نامے میں سمندر کے جانور کا بولنا بنی اسرائیل پر الٰہی غضب کی علامت ہے، جو ۶۶ء سے ۷۰ء کے درمیان یہودیوں کو مذہبی توہین، نفسیاتی دباؤ اور قومی ذلت کی صورت میں جھیلنا پڑا، اور جس کا انجام یروشلم کے ہیکل کی مکمل تباہی پر ہوا۔ بعینہٖ، قرآن میں اسی نوع کی تنبیہ قریش کے لیے کی گئی، جو ان کے کفر اور انکار حق کے جواب میں بطور عذاب پیش کی گئی ہے۔ تاہم جب قریش کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا تو یہ سزا ٹال دی گئی۔[25]

حدیث میں جانور کا ذکر — منگول سلطنت

قرآن اور بائیبل کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں، احادیث میں بیان کردہ ''زمین کا جانور'' — جو قیامت کی دس بڑی نشانیوں میں شمار ہوتا ہے — درحقیقت ایک طاقت ور اور جابر زمینی سلطنت کی علامت ہے۔ یہ ایسی سلطنت ہے جو خشکی کی راہوں سے اپنے اثر و رسوخ کو وسیع کرتی ہے، اور اپنی عسکری فتوحات، ظلم و استبداد اور عالمی سطح پر تہذیبی تبدیلیوں کے ذریعے سے دنیا پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ زمینی طاقت نئے عہد نامے میں مذکور ''سمندر کے جانور'' سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ بحری طاقت کے ذریعے سے پھیلتا ہے — جیسا کہ رومی سلطنت، جب کہ ''زمین کا جانور'' بری طاقت کی نمایندگی کرتا ہے۔

۹۔ فیروز دوم (۶۳۲)

۱۰۔ افرخزاد (معروف بہ خسرو پنجم) (۶۳۲)

23. Quran 27:82: https://quran.com/27/82

24. Revelation 13:5–10: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.5-10.NIV

25. https://www.javedahmedghamidi.org/#!/quran?chapter=27&paragraph=35&type=Ghamidi

تاریخی تناظر میں یہ پیشین گوئی واضح طور پر تیرھویں صدی کی منگول سلطنت پر منطبق ہوتی ہے۔ منگول سلطنت انسانی تاریخ کی سب سے بڑی اور مہلک زمینی سلطنت کے طور پر ابھری، جس نے ایشیا سے یورپ تک پھیلے ہوئے وسیع خطے کو تاراج کیا۔ ان کی عسکری یلغار، سلطنتوں کا انہدام اور بین الاقوامی جغرافیائی و سیاسی نظام کی از سر نو تشکیل اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ منگول سلطنت ہی ''زمین کے جانور'' کی علامت ہے، جیسا کہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔

شکل 1: منگول سلطنت اپنے عروج پر—تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت جو زیادہ تر زمینی حملوں کے ذریعے سے پھیلی، اور حدیث میں ''زمین کے جانور'' کے طور پر علامتاً بیان کی گئی ہے[26]۔

مغرب سے سورج کا طلوع ہونا

احادیث میں قیامت کی بڑی نشانیوں میں مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ''کسی تہذیب پر سورج کا طلوع ہونا'' مختلف زبانوں اور ثقافتوں میں ایک استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جو کسی تہذیب کے اثر و رسوخ، طاقت اور عروج کی علامت ہے۔ اس استعارے میں سورج کا ذکر تہذیبوں کے

26. https://en.wikipedia.org/wiki/Mongol_Empire#/media/File:Mongol_Empire_map_2.gif

عروج و زوال کے تاریخی ادوار کو نمایاں کرتا ہے، جہاں طاقت اور قیادت مختلف خطوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کسی تہذیب پر سورج کا طلوع ہونا عام طور پر اس تہذیب کے عروج کی علامت سمجھا جاتا ہے اور کسی تہذیب پر سورج کا غروب ہونا عام طور پر اس کے زوال کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

علامات قیامت کے تناظر میں، مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کی تشریح مغربی تہذیب کے عروج کے طور پر کی گئی ہے۔ یہ عروج کا سفر بارھویں صدی کے قرون وسطیٰ کے نشاۃ ثانیہ[27] سے شروع ہوا، جو یورپ میں فکری اور علمی بیداری کا دور تھا، جس میں یونانی اور عربی علوم کے تراجم کے ذریعے سے قدیم دانش کی بازیافت، سکولاستیک فلسفے کی ترقی، یونیورسٹیوں کا قیام اور قانون، سائنس اور تعمیرات میں نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس دوران میں عوامی ادب میں ترقی، مذہبی اصلاحات اور صلیبی جنگوں کے نتیجے میں ثقافتی تبادلوں نے یورپی تہذیب و دانش کی بنیادوں کو مزید مضبوط کیا۔ بعد میں چودھویں سے سترھویں صدی کی نشاۃ ثانیہ اور سولھویں صدی کی اصلاحی تحریکوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان تحریکوں نے یورپ میں فکر، سائنس اور طرز حکمرانی میں گہرے انقلابات برپا کیے، جو بالآخر مغرب کو ایک غالب عالمی طاقت کے طور پر قائم کرنے کا باعث بنے۔

زمین کے جانور کے ساتھ قربت

حدیث[28] میں مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کو قیامت کی نشانیوں میں پہلی نشانی کہا گیا اور زمین کے جانور کو اس کے فوراً بعد کی ایک بڑی نشانی کے طور پر بیان کیا گیا۔ مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کی یہ نشانی دس بڑی نشانیوں[29] میں سب سے پہلے پوری ہوئی۔ قرون وسطیٰ کی بارھویں صدی کی نشاۃ ثانیہ[30] کے بعد زمین کا جانور، جس کی علامتی تشریح تیرھویں صدی میں منگول سلطنت ہے، کے نکلنے کا واقعہ رونما ہوا۔

ایمان لانے کا فائدہ نہ ہونا — ایک تنبیہ

حدیث[31] میں بیان ہوا ہے کہ جب سورج مغرب سے طلوع ہو گا تو لوگ اسے دیکھ کر ایمان لے آئیں گے،

27. https://en.wikipedia.org/wiki/Renaissance_of_the_12th_century
28. Sahih Muslim 2941a: https://sunnah.com/muslim:2941a
29. Sahih Muslim 2901a: https://sunnah.com/muslim:2901
30. https://en.wikipedia.org/wiki/Renaissance_of_the_12th_century
31. Sahih Bukhari 4636: https://sunnah.com/bukhari:4636

لیکن اس وقت ایمان لانا بے سود ہو گا۔ بعض احادیث[۳۲] میں زمین کے جانور اور دجال کو بھی ان نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے جن کے ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانا کسی نفع کا باعث نہیں ہو گا۔ اسی نوعیت کی ایک تنبیہ ہمیں سورۂ انبیاء[۳۳] میں یاجوج ماجوج کے کھلنے کے حوالے سے بھی ملتی ہے، جب لوگ اعتراف کریں گے کہ ”بے شک، ہم ظالم تھے“۔

یہ احادیث اور قرآن کی آیت ایک واضح تنبیہ ہیں، کیونکہ یہ نشانیاں قیامت کے قریب واقع ہوں گی۔ اور یہ قیامت کے دن کا منظر نامہ ہے کہ کسی شخص کا ایمان لانا اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا اور لوگ اعتراف کریں گے کہ ”بے شک، ہم ظالم تھے“۔ یہ تنبیہ ان نشانیوں کے قیامت سے قریب الوقوع ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ نشانیاں قیامت سے کتنی قریب ہیں، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہ پیغام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ مہلت ختم ہونے سے قبل ایمان لے آئیں اور خالص توبہ کے ذریعے سے اپنی اصلاح کر لیں، اس سے پہلے کہ رجوع کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔

[باقی]

32. Sahih Muslim 158: https://sunnah.com/muslim:158

33. Quran 21:96-97 https://quran.com/21/96-97

محمد ذکوان ندوی

لفظ اور معنی کا تعلق

ایک سیکولر مسلمان تاجر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ خدا اور 'مذہب' میں یقین نہیں رکھتے، البتہ قرآن کو وہ ایک ''ونڈرفل کتاب'' (wonderful book) مانتے ہیں۔ قرآن سے متعلق انھوں نے اپنی کئی 'دریافتیں' بتائیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ قرآن کی آیت 'فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ'، ''تو اُن کے ساتھ جو عورتیں ہیں، اُن میں سے جو تمھارے لیے موزوں ہوں، اُن سے نکاح کرلو'' (النساء ۴: ۳) سے مراد معروف معنوں میں، عورتوں سے نکاح کرنا نہیں، بلکہ اِس کا مطلب: سماج کے بے چین افراد سے مل کر اُن کے ساتھ ہم دردی اور تعاون کا معاملہ کرنا ہے۔

اِس مجتہدانہ تفسیر کی لغوی تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے مخصوص استدلالی انداز میں انھوں نے فرمایا کہ عربی لغت میں 'الناس' اور 'النساء'، دونوں الفاظ کا مادہ (root) ''ن، س، و'' ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عربی زبان میں اِس مادے کا بنیادی مفہوم ہے: بے چین و مضطرب افراد۔ اِسی طرح انھوں نے بتایا کہ لفظ 'النساء' اسمِ جنس (generic noun) ہے، وہ اسمِ تخصیص (particular noun) نہیں ہے۔ لہٰذا 'فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا، فَوَاحِدَةً'[1] سے مراد ایک سے زیادہ نکاح نہ ہونے کی صورت میں، صرف ایک عورت سے 'نکاح' کرلینا ہرگز مراد نہیں ہو سکتا۔

میں نے عرض کیا: اسم جنس سے مراد وہ اسم ہے جو کسی نوع کے ہر فرد کے لیے مستعمل ہو، مگر وہ اُس فرد

۱۔ النساء ۴: ۳۔ ''پھر اگر ڈر ہو کہ (اُن کے درمیان) انصاف نہ کر سکو گے تو (اِس طرح کی صورت حال میں بھی) ایک ہی بیوی رکھو''۔

کے صرف کسی ایک جزو پر نہ بولا جا سکے۔ جیسے آدمی، عورت، وغیرہ۔ لہٰذا مثال کے طور پر، آدمی یا عورت کے کسی عضو کو آدمی یا عورت یقیناً نہیں کہا جا سکتا۔

تاہم قرآن کی مذکورہ آیت کے وہ معانی جو آپ نے ارشاد فرمائے، مستند اور متداول لغات عرب میں سرتاسر اجنبی ہیں۔ آپ کے ارشاد 'فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا، فَوَاحِدَةً' سے مراد ایک عورت سے نکاح نہیں، کیونکہ لفظ 'النِّسَآء' اسم جنس ہے۔ اِس ارشاد کے متعلق عرض ہے کہ زیر بحث آیت میں لفظ 'وَاحِدَةً' ایک سے زیادہ نکاح نہ ہونے کی صورت میں، واضح طور پر صرف ایک عورت سے نکاح کے مفہوم پر دلالت کر رہا ہے۔ انھوں نے اِس بات کی تردید میں مزید 'دلائل' دیے، جو اُنھی کے الفاظ میں یہاں نقل کیے جا رہے ہیں:

An-Nisa: (النساء) The urges. The root word is noon-seen-alif means urge, desire- I have no idea why all scholars ignore this root word. The popular root word of nisa is noon-seen-waw(ن س و)._Please check the basic meaning of 'Nisa' in Edward William Lane (1801-1876) -Arabic-English Lexicon- page .2785

For the basic meaning of nisa- urge - Staff or stick with which cattle's or beasts are driven is called-منسأةQuran 34: 14 -مِنسأته-his stick/ staff; منسأة is one of the derivative of nisa [نسا]. Al-Nisa means specific urge of an individual. When I inquired the reason for ignoring ن س أ as the root word of نساء they would simply defend by saying it is against the convention, no valid reason was given.

چنانچہ اِس لغت غریب اور اِس عجیب 'تحقیق' کے مطابق، سورۂ نساء کی آیت نمبر ۴ کا ترجمہ خود موصوف محترم کے اپنے الفاظ میں سنیے اور اِس نادر ترین نکتہ سنجی پر سر دھنیے:

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا، فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا:

If you fear that you shall not be able to deal justly to yourself, concerning the unmatched/ unique/ isolated urges, then merge (فَانۡکِحُوۡا) what seems suitable from the urges [nisa] of your choice, two or three or four; but if you fear that you shall not be able to deal

justly with them, then only one, or which you can control, that will be more suitable, to prevent you from doing injustice to you.

زبان کے اِس عجیب بیان واستدلال پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے:

بریں علم و دانست، بباید گریست!

لفظ اور اُس کا مفہوم

یہاں مجھے لفظ اور معنی کے اِس رشتے سے متعلق استاذ وحید الدین خاں کی ایک قیمتی تحریر یاد آ رہی ہے۔ ذیل میں صرف اُس کا ایک متعلق حصہ ملاحظہ فرمائیں:

''ہر لفظ کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔ یہ مفہوم لفظ کے ساتھ اُس کے جزوِ لاینفک (inseparable part) کے طور پر شامل رہتا ہے۔ جس طرح لفظ تاریخ میں سفر کرتا ہے، اُسی طرح اُس کا مفہوم بھی ساتھ ساتھ سفر کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان ہر دور کے لوگوں کے لیے باہم ایک قابل فہم وسیلہ بنی رہتی ہے۔ اگر لفظ اور معنی کے درمیان خلا واقع ہو جائے تو انسانوں کے درمیان بامعنی تبادلۂ خیال ختم ہو جائے گا اور انسانی بستیاں عملاً گونگے لوگوں کی بستیاں بن کر رہ جائیں گی۔

اِس معاملے کو عام طور پر اہلِ علم نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ شاہ اسماعیل شہید دہلوی اپنی کتاب ''عبقات'' میں اِس نقطۂ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'لا یخفی علی من له أدنی ممارسة بأسالیب الکلام أن هذا القول ناش عن جهل متراکم، إذ وضع الألفاظ لمعانیها من المتواترات' (عبقۃ: ۵) یعنی اسالیب کلام پر جس شخص کو ادنیٰ تعلق اور ممارست حاصل ہے، اُس سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ یہ نقطۂ نظر (کہ لفظ اپنے معنی کے ساتھ متواتر نہیں ہوتا) سر تا سر جہالت ہے۔ اِس لیے کہ لفظ کا اپنے معنی کے لیے وضع ہونا ایک ایسا عمل ہے جو تواتر پر مبنی ہے۔ ('میزان'، جاوید احمد غامدی ۳۳)

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ عربی زبان کا ایک لفظ 'أخ' ہے۔ یہ لفظ اپنے ابتدائی لغوی مفہوم کے لحاظ سے، سگے بھائی (blood brother) کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر اِسی کے ساتھ اِس کا ایک استعاراتی مفہوم (metaphorical meaning) بھی ہے، یعنی کسی کو غیر خونی رشتے کے باوجود اظہار تعلق کے لیے بھائی کہنا۔ 'أخ' کا یہ استعاراتی مفہوم بھی قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے اور اب تک مسلسل طور پر وہ اُسی طرح لوگوں کے درمیان بولا اور سمجھا جاتا ہے۔

عرب میں ظہور اسلام سے قبل کا جو زمانہ تھا، اُس کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ابو تمام الطائی (وفات: ۲۳۱ھ)

نے قدیم عرب شعرا کے کلام کا ایک منتخب مجموعہ تیار کیا تھا جو بعد کو ''دیوان الحماسة'' کے نام سے شائع ہوا۔ اِس مجموعے میں جاہلی دور کے ایک تغلبی شاعر عمیر بن شییم بن عمرو القطامی (وفات: ۱۳۰ھ) کے کچھ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ اِن میں سے ایک شعر یہ ہے:

وأحيانًا علٰى بكر أخينا
إذا ما لم نجد إلا أخانا

''اور کبھی ہم اپنے بھائی بنو بکر سے لڑ جاتے ہیں۔ جب ہم اپنے بھائی کے سوا کسی اور کو نہیں پاتے۔''

عرب شاعر کے اِس شعر میں 'أخ' کا لفظ اپنے ابتدائی مفہوم میں نہیں ہے، یعنی وہ سگے بھائیوں کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ اِس شعر میں یہ لفظ اپنے استعاراتی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ شاعر نے جب یہ لفظ اپنے شعر میں اس کے استعاراتی مفہوم میں استعمال کیا۔ اُس وقت یہ لفظ اپنے اِس مفہوم کے لحاظ سے ایک معروف لفظ بن چکا تھا، اِس لیے کسی کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی۔

اِسی طرح ۱۹۲۸ء میں شیخ حسن البنا کی قیادت میں مصر میں عربوں کی ایک مذہبی تنظیم بنی۔ اِس کا نام ''الإخوان المسلمون'' رکھا گیا۔ تنظیم کے اِس نام میں ''الإخوان'' کا لفظ اپنے ابتدائی لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے استعاراتی معنی میں ہے، یعنی سگے بھائیوں کے معنی میں نہیں، بلکہ اسلامی بھائیوں کے معنی میں۔

اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ وہ 'الإخوان المسلمون' کے نام کو اُس کے ابتدائی لغوی معنی میں لے اور یہ کہے کہ یہ سگے بھائیوں (blood brothers) کی ایک تنظیم ہے، تو اُس کی یہ بات بلاشبہ ایک غیر علمی بات ہو گئی۔ کوئی بھی ذی علم آدمی اِس کو اہمیت نہیں دے گا اور نہ وہ اِس کی ضرورت سمجھے گا کہ اِس کا جواب دیا جائے ــــــ یہی معاملہ تمام مستعمل عربی الفاظ کا ہے۔'' (ماہ نامہ الرسالہ، اگست ۲۰۱۴ء)

حقیقت یہ ہے کہ لفظ ہمیشہ اپنے مفہوم کے ساتھ سفر کرتا ہے، اُس سے بالکل مجرد ہو کر نہیں۔ مزید یہ کہ لفظ کا یہ مفہوم محض لغات کی بنیاد پر متعین نہیں ہوتا، بلکہ اُس کا تعین ہمیشہ اہل زبان کے اپنے استعمالات (usages) کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں، کسی لفظ کا ایسا مفہوم بیان کرنا جو زبان کے اصل مفہوم سے معریٰ اور اُس کے استعمالات کے خلاف ہو، اُس سے استدلال ہرگز درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس طرح کے کسی استدلال کے لیے ضروری ہے کہ لفظ زبان و لغت اور استعمالات، دونوں اعتبار سے، اپنی واضح علمی بنیاد رکھتا ہو۔

[یکم جنوری ۲۰۲۴ء]

خورشید احمد ندیم

دین یا فرقہ؟

ہمارا مسئلہ دین نہیں، فرقہ و مسلک ہے۔ ہم اسی عصبیت میں جیتے اور اسی کو دین سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی فرقہ دارانہ شناخت کے تحفظ کے لیے پُرجوش ہیں، نہ کہ دین کے لیے۔

امت کا مرکز و محور پیغمبر کی ذات ہوتی ہے۔ پیغمبر ہی سے امت بنتی ہے۔ اس شجر طیبہ سے بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ وہ لوگ جو حالت ایمان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے (الذین معہ)۔ وہ جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں وقت گزارا (امہات المومنین، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں، نواسے نواسیاں، خدام) یہ سب ہمارے سر آنکھوں پر۔ ہمارا ان سے محبت و عقیدت کا رشتہ ہے، جو بہت گہرا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ اس پاکیزہ شاخ کے برگ و بار ہیں جو ہماری محبت و عقیدت کا حقیقی مرکز ہے۔ ہم جب شجر کے بجاے شاخوں کو اپنی شناخت بناتے ہیں تو ترتیب الٹ جاتی ہے۔ یہیں سے فرقہ دارانہ عصبیت جنم لیتی اور پھر دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔

فرقے سے آگے ایک درجہ اور ہے۔ یہ مسلک ہے۔ ان شاخوں پر جو رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں، جو پھل لگتے ہیں، ہمارے جسم و جاں ان سے معطر ہوتے اور ہماری روحانی غذا کا سامان بنتے ہیں۔ یہ ہماری ضرورت ہیں اور ہمیں بہت عزیز ہیں۔ ان کا یہ رنگ اور ذائقہ اس وجہ سے ہے کہ یہ اسی شجر طیبہ کا حصہ ہیں۔ یہ ان کا شخصی جوہر نہیں۔ اگر یہ اس شجر سے الگ ہو جائیں تو ہمارے لیے ناقابل ذکر ہو جائیں۔ ہم ایک درجے میں ان کو بھی اپنی شناخت بنا لیتے ہیں۔ یہ مسلکی تعصب ہے۔ یہ تعصب کی ایک اور دیوار ہے جو ہم کھڑی کر دیتے ہیں۔ اب ایک شجر کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں اور ہم نے ان کے درمیان دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ دیوار کے اِس طرف رہنے

والے اُن پھولوں کی مہک سے محروم ہیں جو دوسری طرف کھلے ہیں۔ اُدھر بیٹھا ہوا اُس پھل کے ذائقے سے بے خبر ہے جو دیوار کے اِس طرف ہے۔

نقصان میں کون رہا؟ وہ سب جنھوں نے خود کو کسی ایک شاخ سے وابستہ کر لیا۔ وہ دوسری شاخوں پر اُگنے والے خیر سے محروم رہ گئے۔ نفع میں وہی رہا جس نے اُس پاکیزہ درخت کو اپنی شناخت بنایا اور اس سے جڑی ہر شاخ پر اگنے والے پھل اور پھول سے اپنی روحانی واخلاقی بالیدگی اور صحت کا اہتمام کیا۔ یہ ابو بکر و علی ہوں یا عائشہ و فاطمہ رضی اللہ عنہم، ان کی پاکیزہ سیرتوں سے اپنے اور اہل خانہ کے کردار کو منور کیا۔ تمام فقہوں اور علما سے رہنمائی لی اور سفینۂ حیات کو بحر شریعت سے نکلنے نہیں دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہدایت کا واحد ماخذ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ہم سڑکوں اور چوراہوں پر جو جوش و خروش دیکھتے ہیں، یہ سب ہماری فرقہ دارانہ اور مسلکی شناختوں کا اظہار ہے، جسے ہم دین کے عنوان سے بیان کرتے ہیں۔ اس سے تعلق باللہ کو مضبوط کرنا مطلوب نہیں کہ یہ ریاضت خلوت گاہوں میں ہوتی ہے۔ اس کے لیے لوگ معتکف ہوتے ہیں۔ خود کو دنیاداری سے الگ کرتے اور اپنے پروردگار کے لیے خاص ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ جلوت میں بھی احساس بندگی باقی رہے۔ ہم اگر گلی و بازار کی سرگرمیوں کو اپنی شہ رگ حیات قرار دیتے ہیں تو اس سے مراد ہمارے مسلک اور فرقے کی حیات ہے، نہ کہ دین کی۔ دین کی شناخت قرآن ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ زمین پر بیت اللہ ہے اور مسجد نبوی۔ دیگر شناختیں ہمیں عزیز ہیں، مگر اس شناخت کی نسبت سے۔

دین میں حفظ مراتب اور ترتیب کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ ترتیب بدل جانے سے دین کی صورت بدل جاتی ہے۔ لوگ اس کی سنگینی کو نہیں جانتے اور اسی سے افراط و تفریط کا شکار ہوتے ہیں۔ یہی وہ بے احتیاطی ہے، اہل کتاب جس کا شکار ہوئے۔ قرآن مجید نے اس کو بطور خاص بیان کیا۔ ہمارے اور اہل کتاب کے مابین اصل فرق تلاش کیا جائے تو وہ یہی ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام ہمارے ایمان کا بھی حصہ ہیں، مگر ہم انھیں اللہ کا بندہ اور رسول مانتے ہیں۔ قرآن مجید کے مطابق انھوں نے گھوارے میں کلام کیا اور اپنا تعارف یہی کرایا کہ 'میں اللہ کا بندہ ہوں'۔ سیدہ مریم کا قرآن مجید نے جس اسلوب میں ذکر کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ الہامی ادب میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ یہ بیان، مگر جس طرح حفظ مراتب کے ساتھ ہوا ہے، وہ خود قرآن مجید کے خدا کا کلام ہونے کی شہادت ہے۔

ہم نے فرقہ دارانہ اور مسلکی تقسیم پر اصرار کیا اور سال کے دنوں کو اپنے مابین تقسیم کر لیا۔ محرم اہل تشیع کے نام ہو گیا اور ربیع الاول بریلوی مسلک نے اپنے نام کر لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب دن اللہ کے ہیں اور ان لوگوں سے ہمارا تعلق اسی نسبت سے ہے۔ یکم محرم کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور دس محرم کو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ۔ رمضان میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اسی مہینے میں ہوئی۔ اس میں چند مستثنیات ہیں۔ جیسے یوم عرفہ۔ جیسے ماہ رمضان۔ دیگر تمام ایام ان معنوں میں ایک جیسے ہیں کہ ان شخصیات سے ہمارا تعلق بھی یکساں طور پر قائم رہنا چاہیے۔ جنھیں ہم محرم میں یاد کرتے ہیں، ان کی سیرت کو ہم سال کے دوسرے مہینوں میں بھی فراموش نہ کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کچھ دن کسی واقعے کی نسبت سے اہم ہو جاتے ہیں اور انھیں بطور خاص منایا جاتا ہے۔ اس میں حرج نہیں۔ حرج اس میں ہے کہ اسے تشخص کے طور پر منایا جائے، نہ کہ ایک پیغام کی یاد دہانی کے لیے۔

پاکستان میں محرم کے جلوسوں کی حفاظت کے لیے پولیس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جب سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہما سب مسلمانوں کے لیے یکساں محترم ہیں تو خوف کس سے ہے؟ یہ کالم اسی سوال کا جواب ہے۔ ایک طرف وہ نابالغ واعظ ہے جس کی ابھی تک مسیں بھی نہیں بھیگیں اور وہ منبر پر آبیٹھا ہے۔ اس کے لیے جلوس دینی سرگرمی نہیں، ایک گروہی امتیاز کی نشانی ہے یا مالی منفعت کا ذریعہ۔ دوسری طرف وہ شخص بیٹھا ہے جو اس جلوس کو اپنے تشخص کے لیے خطرہ سمجھ رہا ہے۔ دونوں کا دھیان سیدنا حسین کی شخصیت اور کردار کی طرف نہیں، اپنے اپنے تشخص کی طرف ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ جلوس برآمد ہوا تو یہ مخالف فرقے کے غلبے کا اظہار ہے۔ دوسرا اس گمان میں ہے کہ جلوس نہ نکلا تو اس کی شناخت خطرے میں پڑ جائے گی۔ یوں تصادم کی وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے بچنے کے لیے جلوس پولیس کے پہرے میں چلتے ہیں۔

حل ایک ہی ہے۔ مسلمان اپنی شناخت کا واحد حوالہ اپنے رسول اور نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بنائیں۔ اللہ نے ان کا نام 'مسلمان' رکھا ہے اور انھیں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی بنایا ہے۔ ہر نبی کے امتی اپنے اپنے دور کے مسلمان تھے اور ان کا دین اسلام تھا۔ اب قیامت تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دور ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب امتی مسلمان ہیں۔ یہی ہماری شناخت ہے۔ اسی میں ہماری عزت ہے۔ اقبال نے اسی کو بیان کیا ہے کہ 'آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است'۔ ختم نبوت پر اقبال کا اصرار اسی سبب سے ہے۔ انھوں نے خبردار کیا ہے کہ ہم تشخص کے لیے اس نسبت کو کم اہم سمجھتے ہوئے، اگر کسی اور شناخت کو حوالہ

بنائیں گے تو اس میں چھپے خفیہ اشارے کو نظر انداز کریں گے۔ خبردار رہیں کہ ایسی شناختوں اور گروہ بندی پر اصرار بطور امت ہمارے لیے کتنا خطرناک ہے۔ اگر ہم اقبال کی بات کو سامنے رکھیں تو شاید جلوسوں کے لیے پولیس کے پہرے کی ضرورت نہ رہے۔ اقبال کا کہنا ہے:

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہُشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہُشیار باش

(بشکریہ: روزنامہ دنیا، لاہور، ۵/ جولائی ۲۰۲۵ء)

محمد بلال

حیات امین احسن

(۲۳)

باب ۱۷

نام ور شخصیات: امین احسن کی نظر میں

امین احسن نے اپنی تحریروں اور گفتگوؤں میں رسمی اور غیر رسمی انداز میں مختلف نام ور شخصیات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس سے بھی امین احسن کی شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ ذکر رسمی اور غیر رسمی، دونوں اسالیب میں ہوا، اس لیے بعض شخصیات کا ذکر باقاعدہ اور تفصیلی اور بعض شخصیات کا ذکر مختصر اور سرسری سا ہے۔ اس سرسری بیان سے بھی امین احسن کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ امین احسن کا برصغیر پاک وہند کی بڑی بڑی شخصیات کے ساتھ ملنا جلنا رہا، اس لیے ان شخصیات کے بارے میں ان کی آرا تاریخی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔

سقراط

کتاب ''سقراط'' کے مصنف ڈاکٹر منصور الحمید لکھتے ہیں:

''۱۹۹۶ء کی گرمیوں میں دمام (سعودی عرب) سے پاکستان گیا تو میں نے اپنی کتاب ''سقراط'' مولانا اصلاحی ؒ کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا ان دنوں اپنی بیماری کے باعث پڑھنے سے تقریباً معذور تھے اور بمشکل چند

صفحات الٹ پلٹ لیتے تھے لیکن سقراط کی شخصیت سے دلچسپی کی بناء پر انہوں نے میری کتاب کے پچاس ساٹھ صفحات تک پڑھ ڈالے۔ اس موقع پر میں برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ تین چار نشستوں میں مولاناؒ کی گفتگو کا موضوع سقراط ہی رہا۔ میں نے یہ گفتگو اس وقت ریکارڈ کر لی اور اسے مرتب کر کے مضمون کی صورت میں ارسال کر رہا ہوں۔ یہ حتی الامکان مولانا مرحوم کے الفاظ ہی میں ہے:

”مجھے جس طرح قرآن مجید سے دل چسپی ہے، ایک زمانے میں اسی طرح سقراط سے بھی دل چسپی رہی ہے۔ گو میں نے دیگر فلاسفہ کو بھی پڑھا ہے لیکن سقراط کو نہایت غور سے اور حرف بحرف پڑھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی باتیں عقل و فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسانی ذہن کے تقاضوں کے مطابق بات کرتا ہے۔ قدیم یونانی حکماء میں سے ارسطو نہایت پڑھا لکھا آدمی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ براہ راست انسانی فطرت سے اسے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ارسطو میں اپنے ذوق کی غذا نہیں ملی جبکہ سقراط کی باتیں مجھے فطرت کے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ وہ مصنوعی طور پر پڑھا لکھا نہیں تھا۔

میری دل چسپی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان الجھنوں کو جو میرے ذہن میں ہوتی تھیں، ایک نہایت حکیمانہ سوال کی شکل میں سامنے لے آتا تھا۔ اگرچہ اس کے جو جوابات نقل ہوئے ہیں مجھے اس میں کمیاں محسوس ہوتی ہیں لیکن مجھے اس کے جوابات سے کم اور اس کے سوالات سے زیادہ دل چسپی رہی ہے۔ پھر وہ جس طرح جرح کر کے انسانی ذہن کو اضطراب میں ڈال دیتا ہے، یہاں تک انسان غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کے عین مطابق ہے قرآن مجید بھی انسان کی غور و فکر کی صلاحیتوں ہی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ سقراط کو پڑھنا، میرے لیے قرآن مجید سمجھنے میں بھی مدد و معاون ثابت ہوا ہے۔

فلسفہ کی تاریخ میں بیشتر فلاسفہ ناقل ہیں۔ جو کچھ پہلے کہا گیا اسی کو تھوڑا سا بدل کر ذرا مختلف انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ سقراط میں یہ خوبی ہے کہ وہ خلاق بھی ہے اور موجد بھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر فلاسفہ انسانی فطرت سے براہ راست تعرض نہیں کرتے جبکہ سقراط میں خاص بات یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کو براہ راست چھیڑتا ہے۔ پے در پے سوالات سے ہمارے اندر کی الجھنوں کو اتنا واضح کر دیتا ہے کہ انسان خود سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ فلاسفہ معاشرہ سے ڈرتے بلکہ معاشرہ کے اسیر ہوتے ہیں۔ سقراط نہ معاشرہ سے ڈرتا ہے نہ معاشرہ کا اسیر ہے۔ اس کی زندگی کسی بادشاہ یا حکومت سے وابستہ نہیں رہی۔ اس کا سب سے الگ اپنا ہی ایک دائرہ ہے جس میں اسی جیسے کچھ لوگ ہیں۔ اس لیے وہ محض مفکر ہی نہیں ایک لیڈر بھی ہے۔

سقراط کی زندگی بے عیب ہے، اس کا اخلاق نہایت پاکیزہ ہے، علم اس کی باتوں سے برستا ہے، اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ نبی رہا ہو۔ انبیاء جتنے بھی ہیں وہ سب کے سب قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں۔ سقراط میں

وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جو انبیاء میں ہوتے ہیں۔ ابنیاء کا علم انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ براہ راست ہے۔ یہی حال سقراط کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سقراط کو پڑھنے کے ابتدائی دور ہی میں میری یہ رائے تھی کہ نبی ہونے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہیں پھر جس زمانے اور جس ملک میں وہ پیدا ہوا اس میں اسی طرح کا آدمی نبی ہو سکتا تھا۔

تاریخ کی کسی قدیم شخصیت کو نبی ماننا یا نہ ماننا خدا کو ماننے یا نہ ماننے کے مترادف نہیں ہے۔ یہ کوئی عقیدے اور ایمان کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ نبی پر خدا کی وحی آتی ہے اور میرا خیال ہے کہ سقراط کے ضمن میں اس کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ کم سے کم اتنی بات تو طے ہے کہ سقراط بہر حال ہے پڑھے جانے کی چیز۔ اس کے پاس علم بھی ہے، اخلاق بھی ہے اور کردار بھی۔ دنیا کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں کچھ لکھنا اور شائع کرنا درحقیقت دنیا پر احسان کرنا ہے۔‘‘ (سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۴۴)

اسی موضوع پر ڈاکٹر زاہد منیر عامر امین احسن کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کی تفصیل بتاتے ہیں:

’’بات سوفسطائیہ سے چل کر مولانا اصلاحی کے استاد گرامی اور سقراط پر آپہنچی ہے اس روز مولانا اصلاحی سے گفتگو میں بھی یہی ہوا، البتہ پہلے سقراط پر بات ہوئی اور پھر مولانا فراہی پر۔

مولانا نے یونانی فلسفے کی تاریخ کے حوالے سے فرمایا کہ آغاز کے تین فلسفیوں کو چھوڑ کر باقی سب فلسفی یونہی ہیں۔ یہ تین فلاسفر سقراط، افلاطون اور ارسطو ہیں۔ ان میں بھی سقراط اصل فلسفی ہے، باقی دونوں اس کے سلسلے سے وابستہ ہیں اور تینوں کے خیالات اسلام سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ مجھے اس بات سے تعجب ہوا لیکن بعد ازاں سقراط سے متعلق اکثر ماخذ سے یہ معلوم ہوا مثلاً ول ڈیوراں (Will Durant) نے The Story of Philosophy میں بتایا ہے کہ سقراط نہ صرف توحید پرست تھا بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدے پر بھی ایمان رکھتا تھا۔ چند برس قبل ’’سقراط‘‘ کے عنوان سے منصور الحمید صاحب کی کتاب منظر عام پر آئی تو اس میں یہ بحث اور زیادہ وضاحت سے ابھری، یہ کتاب بہت محنت اور سلیقے سے لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں بات کچھ بڑھ گئی ہے۔

سقراط کی توحید پرستی کی حد تک تو بات قابل تسلیم ہے لیکن افلاطون اور ارسطو کے حوالے سے اسلامی تعلیمات سے کامل مطابقت کی بات زیادہ قابل فہم نہیں تھی۔ اگرچہ افلاطون اور ارسطو بھی ذات باری تعالیٰ پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن ان کے بعض افکار اسلامی تعلیمات سے ’’کامل مطابقت‘‘ نہیں رکھتے۔

بہر حال یہ بات اطمینان بخش ہے کہ ۱۹۹۱ میں جب ’’فلسفے کے بنیادی مسائل‘‘ سے متعلق مولانا کی

کتاب شائع ہوئی تو اس میں نہ صرف یہ کہ افلاطون اور ارسطو کے افکار کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار نہیں دیا گیا بلکہ مولانا نے ''افلاطون کے فلسفہ کی غلطی اور ''ارسطو کے فلسفہ کی خامی'' کی نشان دہی بھی کی۔

مولانا اصلاحی اپنی زندگی میں جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ ان کے استاد گرامی مولانا حمید الدین فراہی کی شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنے استاد گرامی کے طریقۂ تعلیم کو ''سقراطی طریقۂ تعلیم'' قرار دیا ہے۔ مولانا کے نزدیک ''سقراطی طریقۂ تعلیم'' کیا ہے اس کی وضاحت انہوں نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کی تھی:

''مولانا کا طریقۂ تعلیم ایسا نہیں تھا کہ پکا پکایا سامنے رکھ دیا جائے۔ درحقیقت وہ طالب علم کی استعداد اور ذہانت کو بیدار کرتے تھے۔ اس کے اندر سوالات پیدا کرتے تھے۔ اگر وہ مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت ظاہر کرتا تو وہ کچھ رہنمائی دیتے تھے ورنہ خاموش ہو جاتے۔ یہ ''سقراطی طریقۂ تعلیم ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۱)

مارکس آریلیئس (Marcus Aurelius)

عبدالرزاق صاحب اپنی ۲۸ر جنوری ۱۹۹۴ء کی ڈائری میں فلسفی مارکس آریلیئس کے حوالے سے امین احسن کی رائے بیان کرتے ہیں:

''مولانا نے خاص طور پر مارکس آریلیئس کا نام لیا اور کہا کہ میں فلسفہ میں اس کا مرید ہوں۔ اس فلسفی سے مولانا بڑے متاثر نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی کہ اگر وہ اپنے آپ کو پہچاننا اور زندگی کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں تو وہ مختلف حکماء اور فلسفیوں کی کتابوں کو ضرور پڑھیں ان کو پڑھنے کے بعد آپ کو پتہ چلے گا کہ جس فلسفی کو حقیقت کا ادراک ہو گیا اس کو سب کچھ مل گیا۔ وہ روم اور ایران کی بادشاہی کو اپنے قدموں تلے کچل دیتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ وہ بادشاہ کی کسی غلطی پر اسے پورے دربار کے سامنے ڈانٹ پلا دیتا ہے۔ ایسا شخص بادشاہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔''

(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۷۷)

ڈارون

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے امین احسن نے مسئلۂ ارتقا اور ڈارون کے بارے میں کہا:

''کائنات ارتقاء ہی کے ذریعے سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ ارتقاء بجائے خود صحیح ہے لیکن ڈارون کی توجیہ

غلط ہے۔

انسان پہلے کیچڑ ہی میں تھا۔ایک خاص فارم سے اس نے ترقی کی،ارتقاء ہوتے ہوتے وہ اس فارم میں آیا کہ وہ ایک انسان بن سکے۔اللہ نے ارادہ کیا اور اس چیز (فارم) سے آدم وجود میں آئے اور ان کا جوڑا پیدا کیا گیا۔ سائنس والے مانتے ہیں کہ حقیقت میں ایک ہی چیز تھی جس میں نر اور مادہ دونوں کے جراثیم موجود تھے۔ لیکن یہ سب ایک مدبر، حکیم اور خبیر نے کیا...آخر اس کی کیا توجیہ ہے کہ کیونکر ایک چیز بنتی چلی گئی۔آپ سے آپ تو کچھ بھی نہیں ہوتا،ایک درخت کی شاخ بھی ایک خاص سکیم کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔ڈارون کی تقریر پر ہمیں اعتراض ہے اس میں جگہ جگہ معقولیت نہیں ہے۔(تاہم) جب ارتقائے آدم ہو گیا اور جب آدم وجود میں آ گئے تو نسل اِنسانی وجود پذیر ہو گئی۔اب وہ پہلا دور ختم ہو گیا۔ایک فٹسٹ (Fittest) جب وجود میں آ جائے تو دوسری چیز اس میں مداخلت نہیں کرتی Survival of the Fittest (بقائے اصلح) کا یہی مطلب ہے کہ جب ایک Fittest وجود میں آ جائے اپنے راستے پر چلے گا۔

ہم ارتقاء کے اصول کے بقائے اصلح Survival of the Fittest کے قائل ہیں۔یہ اصول ہے لیکن ڈارون کی توجیہ نہایت احمقانہ ہے۔وہ ایک مصنف ہے ایک تقریر کرنے والا ہے اسے زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔‘‘(سہ ماہی تدبر، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۶)

علامہ اقبال، حالی اور فارابی

اپریل ۱۹۳۸ء میں ’’بلبلِ نالاں‘‘ کی روح ’’اجڑے گلستان‘‘ سے پرواز کر گئی۔اس المیہ نے امین احسن کو بے حد متاثر کیا۔انھوں نے اس پر کچھ اس انداز سے لکھا کہ مولانا الطاف حسین حالی کے بارے میں بھی ان کے خیالات سے آگاہی حاصل ہو گئی:

’’یہ دور ہمارے عروج و اقبال کا دور نہیں، بد بختی و ادبار کا دور ہے۔ہم پاتے کم ہیں کھوتے زیادہ ہیں۔ اونچے درجے کے اشخاص ہم میں اولاً تو پیدا نہیں ہوتے اور اگر دو چار پیدا ہوتے ہیں تو قبل اس کے کہ ان کے جانشین پیدا ہوں، وہ اپنی جگہ خالی چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔اپنی قوم کے ان لوگوں کو گنیے جن کے دم سے آج ہماری آبرو قائم ہے اور پھر دیکھیے کہ ایک ایک کر کے ان کی صف کس طرح ٹوٹتی جا رہی ہے اور کوئی نہیں جو ان کی جگہ لینے کے لیے آگے بڑھے۔قوموں کے مرنے اور جینے کا ایک اصول ہے جو ہمارے موجودہ فلسفۂ قلت و کثرت سے بالکل مختلف ہے۔ہم صرف سروں کو گننے کے عادی ہو رہے ہیں حالانکہ زندگی سروں

سے نہیں بلکہ دماغوں سے زیادہ دلوں سے ہے۔

غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔ استاد مرحوم مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، طلبہ کی مجلس میں اقبال کا شکوہ پڑھ رہے تھے۔ میں اس مجلس میں موجود تھا۔ یہ پہلی مجلس ہے جس میں میں نے شعر کے اثر کو آنکھوں سے دیکھا۔ آنکھوں سے اس لیے کہ اس وقت تک میرے دماغ میں شعر کی خوبیوں اور نزاکتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ میں مجلس میں بیٹھا ہوا صاف سن رہا تھا کہ اقبال کے شعروں کی صدائے بازگشت در و دیوار سے بلند ہو رہی ہے اور آنکھوں سے علانیہ مشاہدہ کر رہا تھا کہ آسمان سے کوئی چیز برس رہی ہے اور ساری زمین ہل رہی ہے۔ میں نے آج تک کوئی مجلس اتنی پُراثر نہیں دیکھی اور اس ایک مرتبہ کے علاوہ شاید کبھی میرے دل نے شاعر بننے کی آرزو نہیں کی، لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہوئی کیونکہ میں نے اقبال بننے کی آرزو کی تھی اور اقبال صرف ایک ہی ہوتا ہے۔...

شاید وکٹر ہیوگو نے کہا ہے۔ زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم الشان ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کے لیے ہمیشہ موت کا انتظار کرتی ہے۔ دنیا کے لیے ممکن ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہو۔ لیکن اقبال کے لیے تاریخ نے اپنے اس کلیہ کو توڑ دیا۔ اقبال کی عظمت کی گواہی دلوں نے ان کی زندگی میں دے دی، اب تاریخ کے لیے صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ وہ دلوں کے تاثرات کو محفوظ اور قلم بند کر لے۔...

مولانا حالی کی زبان بھی تیغ وسناں سے کم نہ تھی، ان کا تیشہ بھی ہمارے عمل واعتقاد کے ہر گوشہ کے لیے بے امان تھا۔ وقت کی سوسائٹی جن عناصر سے مرکب تھی ان میں سے ایک ایک کو چن کر حالی نے پکڑا اور قوم کی عدالت میں مجرم ٹھیرا کر ان کو بے دریغ سزا دے دی اپنی بے پناہ قوت سے ہمارے تمام اعمال و معتقدات کو ایک نئی راہ پر لگا دیا۔ لیکن حالی کا کام آسان تھا۔ وہ قوم کو زمانہ کے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کو

اور زمانہ اپنی تمام رعنائیوں اور دلربائیوں کے ساتھ ان کی رفاقت کے لیے آمادہ کار ہو چکا تھا۔ ان کو جو دیواریں ڈھانی تھیں وہ خود متزلزل ہو چکی تھیں اور جو عمارت بنانی تھی اس کے لیے دستِ غیب خود چونہ اور گارا مہیا کر رہا تھا۔ وہ خزاں کی بلبل ضرور تھے مگر موسم گل کی آمد آمد ان کو شہ بھی دے رہی تھی۔...

اگر اقبال نہ پیدا ہوتے تو یقیناً ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو اس طرح مسخ کر ڈالتی کہ ان کے اندر دین وملت کے لیے حمیت و غیرت کا کوئی شائبہ باقی نہ رہ جاتا، وہ جس طرح ظاہر میں مسخ ہو گئے ہیں اس سے زیادہ ان کا باطن مسخ ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اقبال کو بھیجا جو معلوم نہیں کس طرح

ظلمات کے ان توبرتو پردوں کو چاک کر کے ان کے دلوں میں بیٹھ گئے اور جب تک ان کی روحِ شعر اس کائنات کے اندر کارفرما ہے اس قوت تک ان شاءاللہ ان میں درد کی ایک کسک باقی رہے گی، اگرچہ دلوں کی جگہ سینوں میں پتھر پیدا ہونے لگیں۔ ماہنامہ الاصلاح، اعظم گڑھ، مئی ۱۹۳۸ء۔"(مقالات اصلاحی ۲/ ۴۰۲-۴۰۶)

۸ رجون ۱۹۹۰ء کی بات ہے۔ امین احسن نے اپنی ہفتہ وار نشست میں اقبال پر بات کرتے ہوئے کہا:

"اقبال بہت بڑے شاعر ہیں، بہت اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے شاعری کو عالمگیر بنا دیا۔ ان کی شاعری کی زد سے کوئی چیز نہیں بچتی۔ جہاں چاہے چلے جائیں۔ اس بات نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس لیے کہ شاعری کا ایک محدود مفہوم تھا۔ کوئی یار ہو، کوئی زلف ہو، سرو قد ہو، کچھ ہجر ہو، کچھ اس طرح کی چیزیں۔ اقبال نے تو پورا جہان ہی بنا دیا۔ ہر چیز ان کے دائرے میں ہے۔ ہر جگہ نشانہ لگاتے ہیں۔ اور یہ ہے کہ شاعری کا معیار گرنے نہیں پاتا۔ دوسرے یہ کہ ان کے اندر بڑائی ایک اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ شعر میں کچھ نہیں ہوتا، لیکن شکوئی الفاظ سے شعر ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض شعر بالکل غلط اور بے معنی۔ لیکن وہ شکوئی الفاظ میں شعر بن گیا۔"

ایک مرتبہ امین احسن سے یہ سوال دریافت کیا گیا کہ علامہ اقبال نے وحی کی نفی کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ وحی ایک وجدانی کیفیت ہوتی ہے، جب کہ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ وحی فرشتوں کے ذریعے نازل ہوتی ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

امین احسن نے اس کا جواب کچھ اس انداز سے دیا کہ فارابی اور دیگر مسلم فلسفیوں کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر واضح ہو گیا۔ علامہ اقبال کا کلام، جب کبھی مجھے فرصت ہوتی ہے، میں پڑھتا ہوں۔ جہاں تک میں ان سے واقف ہوں مجھے ان کی باتیں معقول معلوم ہوتی ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں دین اور حکمت کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کلام میں مجھے کہیں ایسی فضول بات نظر نہیں آئی، جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے۔ باقی رہ گئے ان کے خطبات تو ان میں انہوں نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جو میرے نزدیک قابل اعتراض ہیں لیکن ان میں بھی یہ بات میں نے نہیں پڑھی۔ ہو سکتا ہے کسی نے غلط روایت کر دی ہو یا کہیں علامہ صاحب نے فلاسفہ کا کوئی خیال نقل کیا ہو اور وہ خود ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔

آپ نے جو خیال نقل کیا ہے یہ فارابی نے پیش کیا ہے۔ فارابی کے نزدیک وحی اندر کی کیفیات کا ایک بخار ہوتا ہے۔ میں فارابی کو لغو قسم کا آدمی سمجھتا ہوں۔ فارابی اور اس طرح کے دوسرے فلسفی صرف فلسفۂ یونان کے ناقل تھے۔ یہ قابل ذکر لوگ نہیں ہیں۔ یہ اسلامی فلسفہ کو تو کیا سمجھتے، یونانی فلسفہ کے بھی وہ کچھ غلط ناقل

ہی ہیں۔ یہی حال ہمارے متکلمین کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں فلسفہ کی بحثوں میں ان نام نہاد اسلامی فلاسفہ کا حوالہ نہیں دیا کرتا۔“ (سہ ماہی تدبر، فروری ۱۹۸۹ء، ص ۴۵)

مولانا محمد علی جوہر

امین احسن مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ماہنامہ ”میثاق“ میں ”مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ، مدرسۃ الاصلاح میں“ کے زیر عنوان خود لکھتے ہیں:

”فاضل محترم مولانا رئیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمایش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کر دوں۔ میں اس فرمایش کی تعمیل کے لیے آمادہ تو ہو گیا ہوں لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تحریک خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ، یو پی بھارت) کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالب علم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرستہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے اکابر و مشاہیر بھی تشریف لائے، میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کسی جلسہ میں کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔

بڑا عظیم اجتماع تھا، میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا، جلسہ کھلے میدان میں تھا۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سنی نہ جا سکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ لیکن جب مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے رعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر لیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا وہیں پیکر تصویر بن کر رہ گیا... مولانا کی بلند اور پر شکوہ آواز کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچنے لگی۔ اور تقریر کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ یہ مجمع بالکل دیہاتیوں کا تھا۔ اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے، ان دیہاتیوں کے لیے مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ جیسے شخص کی کسی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ لیکن

ان کی تقریر میں ایمان ویقین کی ایسی گرمی اور سوز ودرد کی ایسی گھلاوٹ تھی کہ اس سے متاثر ہونے کے لیے شاید اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے، جو قابل ذکر ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر جب ختم ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک کنارے سے ایک بوڑھا دیہاتی اٹھا اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا اسٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا پکا نکلا کہ اس نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی ان کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا کہ :

''محمد علی جو تو نے کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا۔'' یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی۔''

اس موقع پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے، مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اعظم گڑھ شہر کے لیے روانہ ہو گئے جہاں شب میں ان کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنی تھی، وہ گئے تو ان کے ساتھ 'مدرستہ الاصلاح' کا سارا جلسہ بھی چلا گیا یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے ان کی تقریر میں شرکت کے لیے ان کے ساتھ چلے گئے۔ انھوں نے چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں ان کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڑھ میں ہونے والی مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لیے نہایت حیرت انگیز تھا، میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی تقریر سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اس درجہ میں متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں میرے تصور سے مافوق تھا۔ مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے، وہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا وعظ و تقریر کے جلسوں میں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے لیکن مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر میں شریک ہونے کے لیے نہ صرف یہ کہ سفر کے لیے آمادہ ہو گئے بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسا بلند پایہ آدمی ہیں کہ مولانا فراہی جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ مولانا محمد علی کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے... دوسری صبح کو جب مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی کے ساتھ ان کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ ''جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں، اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی۔''

مولانا نے یہ بات اس اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمائی کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مولانا کو مدرسہ کے جلسہ کے درہم برہم ہو جانے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے، ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علی نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ سن لی تھیں، اس کے بعد جلسہ کا جاری رہنا ان کے نزدیک گویا اضاعت وقت کے حکم میں تھا۔ مولانا نے اس کے بعد متعدد بار مولانا محمد علی کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

''محمد علی کی تقریر میں ایمان ہوتا ہے۔''

ایک مرتبہ بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا کہ:

''چونکہ محمد علی بہت ذہین آدمی ہیں اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے نظم کی طرح ان کی تقریروں اور تحریروں کے نظم کو سمجھنے میں بھی بسا اوقات زحمت پیش آتی ہے۔''

پھر فرمایا کہ:

''کچھ اسی قسم کا حال مولانا محمد علی قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں اور تحریروں کا بھی ہے۔''

(جولائی ۱۹۶۴ء)

[باقی]

نوازش منعم

سفرِ طائف —— احساسات

[مندرجہ ذیل تحریر نہ افسانہ ہے نہ سفر نامہ... یہ محض چند ناتراشیدہ احساسات ہیں جو دوران حج دل پر وارد ہوئے... اور کم و بیش وہیں قلم بند کیے گئے... چنانچہ سفر کی دیگر تفصیلات کا ذکر نہیں ہے۔]

بس رُصیفہ (مکہ) سے صبح ۸:۳۰ بجے نکلی۔ تقریباً ۸۰ عدد حاجی صاحبان اس میں سوار ہوئے۔ اپنے اپنے فوڈ پیکٹس، جوس اور پانی کی ٹھنڈی بوتلیں لیے سبھی نے خوشی خوشی اپنی اپنی سیٹیں سنبھال لیں۔ اخاہ!! ہم طائف جا رہے تھے...۔

بس مکہ کے راستے سے طائف کی طرف جونہی چلنے لگی، دل کی دھڑکن تیز ہوتی چلی گئی...۔ راستے کے دونوں طرف پہلے پہل مکہ کی آبادی چلتی رہی، پھر پہاڑیاں شروع ہو گئیں۔ جب سے ہم مکہ آئے تب سے پہلی بار ریگستانی علاقہ دیکھنے کا موقع ملا۔ ریت... دور دور تک ریت... جن کے بیچ سے سڑکیں نکال لی گئی ہیں۔ ریت کے طویل میدان اور ان میں اگی ہوئی خشک ریگستانی جھاڑیاں... جا بجا... ریت کا رنگ الگ الگ نظر آیا۔ کہیں سفیدی مائل، کہیں بھورا، کہیں سنہرا... روایتی صحرا، اس کے اونچے نیچے ٹیلے، روپہلی ریت پر ہواؤں کے بہنے کے نشانات، فضاؤں کا سناٹا، اس منجمد سکوت کو توڑتی فراٹے بھرتی کاریں، لحیم شحیم بسیں، عظیم الشان عمارتیں، حسین مساجد، شان دار ہوٹل، طعام خانے، دکانیں ہی دکانیں... مکہ سے طائف کے سفر میں پہلے پہل تو یہی نظر آتا رہا۔ بس چلتی رہی۔ پھر پہاڑیاں اور تا حد نظر ریتلے میدان آ گئے۔ میں نے سوچا... آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو پیدل طائف گئے تھے۔ اتنا فاصلہ تو ہو گا کہ کوئی پیدل جا سکے۔ وقت چلتا رہا... بس بھی چلتی رہی... خیالات بھی

چلتے رہے... اتنی دور!!! پیدل؟؟؟؟میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!!!میری جان آپ پر نثار... دین کی خاطر، اللہ کی خاطر، امت کی خاطر... وہ میرا اُمی!!میرا محسن!! پیدل سفر کرتا رہا؟؟!!میرا دل غم سے بھر گیا۔ میں نے کھڑکی کے باہر، دور تلک پھیلے، مہیب صحرا پر نظر ڈالی۔ ذہن دھندلے خیالوں کی تجسیم کرنے لگا...اور احساسات نے کھڑکی کے پار... ریت کی چادر پر...تاریخ کی منظر کشی شروع کر دی...آہ!!! خاتم المرسلیں! رحمۃ للعلمیں! زید بن حارثہ کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ دو دھندلے خیال... دو مدھم خاکے... میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنے دل پر ان امیدوں کو حاوی کیا جو طائف جاتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جاگ رہی تھیں...۔

اہل طائف توحید کی دعوت قبول کر لیں گے۔ میری پکار پر لبیک کہہ اٹھیں گے۔ مسلمانوں کو اہل مکہ کے جور و ستم سے نجات مل جائے گی۔ دین پھیلنے لگے گا۔ کفر کی سیاہی چھٹ جائے گی۔ زمین توحید کے نور سے جگمگا اٹھے گی!!!

میرے احساسات گہرے ہوتے گئے... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سردارانِ طائف سے ملاقات، ان کے سخت اور استہزائی جوابات، پھر ان حاسدوں کی وہ انتقامی رسوا کن کارروائی... اوباشوں کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تاک تاک کر گھٹنوں کے نیچے پتھر مارنا تاکہ آپ لڑکھڑا کر گر جائیں... میرے احساسات کا پردہ تھا اور سیرت رسول کی وہ فلم... پوری آب و تاب سے سارے مناظر یکے بعد دیگرے روشن ہو رہے تھے۔ وہ مناظر، جنھیں میں نے، آپ نے، کئی بار پڑھا، کئی بار سُنا، کئی بار دہرایا ہے... یاربی!! وہ پاے مبارک، وہ دُکھتے زخم، وہ خون سے بھرے جوتے، جسم سے بہتا خون، روح سے رستا خون، امیدوں کا خون! آرزوؤں کا خون! ...ٹپ ٹپ ٹپ...۔ دل کا غم آنکھوں کے راستے بہ نکلا! وہ آنکھ ہی کیا جو اپنے محسن کے دکھ پر رو نہ سکے!!

میری آنکھوں سے بہتے نمکین پانی نے ریتلے میدانوں کا منظر تو دھندلا دیا، مگر احساسات... احساسات گہرے ہوتے گئے!! یا اللہ!! سر پر آگ برساتا آسمان، نیچے جھلستی ریت... واپسی کا سفر آخر کیسے طے کیا ہو گا اُن مبارک زخمی پیروں نے...؟؟

لگژری بس کے AC کا blow عین سر پر اور بہت تیز تھا۔ اس ٹھنڈک میں، آرام دہ reclining chair پر بیٹھی... میں مسلسل باہر دیکھتی رہی۔ پتھروں، کانٹوں، جھاڑیوں سے، گرم تپتی ریت سے، کبھی نشیب تو کبھی فراز سے، میرے احساسات گزرتے رہے۔ AC کی ٹھنڈک سے میرے ہاتھ پیر سُن ہونے لگے تھے۔ دس بج

چکے تھے، مگر طائف ابھی آیا نہیں تھا۔ میں نے بس کے افراد پر اک طائرانہ نظر ڈالی۔ سارے لوگ لگژری کا مزہ لے رہے تھے۔ بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تمام تو نیند کی وادیوں میں کھو چکے تھے۔ میں نے دوبارہ نظر دوڑائی... کوئی تو درد مند دل ہو گا جو جاگ رہا ہو گا!!!... مگر حیف!! سارے حاجی صاحبان گہری نیند سو رہے تھے۔ ایک آہ میرے لبوں سے آزاد ہوئی... ساری امت بھی تو سو رہی ہے۔ آج اسلام زخموں سے چُور ہے، پتھر تاک تاک کر مارے جا رہے ہیں تاکہ خدا کا دین لڑکھڑا کر گر پڑے۔ اُس کے دامن کو داغ دار کیا جا رہا ہے۔ اُس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

مگر امت!! متاع الدنیا کی لگژری بس میں، خوابِ غفلت میں پڑی، زندگی کا سفر طے کیے جا رہی ہے۔ بس کے مسافر بھی غافل پڑے تھے۔ اُس خطۂ زمیں سے غافل جہاں سے اُن کا محسن، اُنھی کے تابناک مستقبل کے لیے، گھنٹوں... تپتی دھوپ میں، تپتے صحرا سے گزرا تھا... اُس فکر سے بے پروا، جس فکر نے اُس جواں سال حُسن کو بوڑھا کر دیا تھا۔ اُس درد سے نا آشنا، جس درد نے ایک حساس، ذمہ دار دل کو ایسا مضطر کر رکھا تھا کہ ذمہ داری سونپنے والے کو خود کہنا پڑا... 'فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا'، ''اے محمد، اگر یہ لوگ اس کلام پر ایمان نہ لائیں گے تو شاید تم اِن کے پیچھے اپنی جان ہی گنوا بیٹھو گے!'' (الکہف ۱۸: ۶)۔

میں نے شیشے سرکا کر بس کی کھڑکی ذرا سی کھولی۔ گرم لُو کا اک زبردست تھپیڑا تیزی سے اندر چلا آیا۔ اُس حدت کو میں اپنے چہرے پر محسوس کرنا چاہ رہی تھی جو میرے محسن نے... کئی میل... بے سروسامان... پیدل چلتے ہوئے جھیلی تھی! کچھ دیر تو میں برداشت کرتی رہی... مگر جب سانس لینا بھی دُشوار ہو گیا... تو میں نے کھڑکی بند کر دی... بے اختیار...!!!!... میرے لبوں سے درود جاری ہو گیا اور آنکھوں سے پانی...!!

وہ جانِ حیاتِ کون و مکاں

وہ روحِ نجاتِ انسانی

وہ جس کی بلندی کے آگے

افلاک ہوئے پانی پانی

وہ فقر کا پیکر، جس کے قدم

چھوتا ہے شِکوۂ سُلطانی

اُن ہی سے مجھے نِسبت ہے مگر
کب اُن کی حقیقت پہچانی؟
احساسِ خطا کی پلکوں سے
آنسو بن کر گر جاتا ہوں!
کہنے کو مسلماں میں بھی ہوں
لیکن......... کہتے شرماتا ہوں
اسلام کی یہ تاریخِ الم!
طوفان اُٹھے، بھونچال آئے
وہ جن کی نظر تھی عرش رساں
گرتے گرتے...... پاتال آئے
روحوں کی بصیرت سلب ہوئی
دل کے شیشوں میں بال آئے
پیغامِ عمل دُہراتے ہُوئے
چودہ سو پریشاں سال آئے!!
محصُور جہادِ ہستی میں
قربانی سے گھبراتا ہوں
کہنے کو مسلماں... میں بھی ہوں
لیکن......... کہتے شرماتا ہوں
طائف میں مقدس خُوں ٹپکا!
مکے میں کبھی... پتھر کھائے
بس ایک تڑپ تھی... کیسی تڑپ!!
انسان...... ہدایت پا جائے!
ہر غم کو لگا کر سینے سے

درماں کے طریقے... سکھلائے

کیا قہر ہے؟؟ یہ انساں...

اُسی محسن کو بھلا کر کھو جائے!!

اُف...! کتنے گناہوں کے ہاتھوں...

دِینی بنیادیں ڈھاتا ہوں!

کہنے کو... مسلماں میں بھی ہوں

لیکن......... کہتے شرماتا ہوں

Monthly
ISHRAQ
Lahore

August 2025
Vol.37 No.8
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ''اشراق'' کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ''اشراق'' کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ''اشراق'' کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ''اشراق'' کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اِس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق